دینی دعوت کے
قرآنی اصول
تصنیف
حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
کتب خانہ رحیمیہ دیوبند

نام کتاب : دینی دعوت کے قرآنی اصول

مصنف : حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند

اشاعت : یکم جنوری ۲۰۰۴ء

باہتمام : محمد شاکر اختر
مالک کتب خانہ رحیمیہ دیوبند

کمپیوٹر کتابت : واصف حسن ایکوریٹ کمپیوٹر
نزد جامع مسجد دیوبند

کیپیٹل آفسیٹ پرنٹرس دیوبند، فون 224549

یہ کتاب!

اُردو میں ایک بے مثل و عالم گیر اضافہ!

تمام عالم انسانی کو مخاطب بنانے والے کی نظام کی صداقت و واقعیت کی حقیقی اور واحد بنیاد اس کے سوا دوسری نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمہ گیر فطرت انسانی کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتا ہو۔

ارشاد خداوندی فطرۃ اللّٰہ اللّتی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللّٰـہ اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کروں جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی اس پیدا کردہ چیز کو بدلنا نہ چاہئے۔ کے تحت فطرتِ انسانی منصوص طور پر ایک ناقابلِ تردید اور ناقابلِ تغیر و اصل ہے کہ جس سے وجودِ انسانی میں متولد ہونے والے بے شمار دواعی و جذبات حرکات و سکنات اور اقوال و افعال وغیرہ نہ صرف ہر آن تغیر پذیر ہی ہیں بلکہ اشرف المخلوقات ہونے کے منصبِ عظیم پر انسان کا فائز ہونا بھی انہی تغیرات پر دائر و سائر ہیں پس فطرتِ انسانی کا مخلوق ہونے کے باوجود جس طرح غیر متغیر ہونا حق تعالیٰ شانہ کی ذاتِ قدیم و واجب الوجود کے غیر متغیر ہونے کو ناقابلِ انکار بنا دیتا ہے اس طرح فطرتِ انسانی سے کائناتِ بدن میں پیدا ہونے والے بے شمار تغیرات اللہ رب العزت کی پیدا کردہ اس کائناتِ عالم میں لامتناہی مخلوقات کے تغیرات کو سمجھنے کے لئے کسی دلیل کا محتاج نہیں رہنے دیتے لہٰذا غیر متغیر ذاتی خداوندی کا مختلف حیثیات سے اپنی لا

محدود تغیر پذیر مخلوقات کو در وبست اپنے احاطۂ قدرت میں رکھنا منطقی طور پر اس حقیقت کو بے غبار بنادیتا ہے کہ انسانیت کے لئے کامل ومکمل نظام صرف وہی ہوسکتا ہے کہ جو انسان کی ذات میں اُس کی فطرتِ غیر متغیر سے پیدا ہونے والے مختلف الانواع تغیرات پر دروبست محیط ہو اور ظاہر ہے کہ ایسا نظام کامل انسان کی محدود عقل تخلیق نہیں کر سکتی بلکہ اس نظام وقانون کا مقنن انسان کے خالق کے علاوہ کوئی دوسرا قطعاً نہیں ہوسکتا۔

اسی لئے بلا خوفِ تردید دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کا آخری دین اسلام غیر متغیر فطرتِ انسانی کی مطابقت کے ساتھ انسان کے تمام تغیر پذیر احوال وکیفیات پر محیط ہونے کے لحاظ سے ومنفرد یکتا اور کامل ترین نظام ہے کہ ادیان ومذاہب اور افکار ونظریات کا کوئی نظام نہ کبھی اس کا ہم قدم بن سکا ہے اور نہ کبھی بن سکے گا۔

اسلام کا نظام اس اصول کی روشنی میں دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والی اقوام وملل کو اگر اُن کے خطۂ عرض کی ماحولی خصوصیات اور معاشرتی روایات کو ملحوظ رکھ کر اُن کو اس دینِ فطرت کی دعوت دی جائیں تو اس کی اثر آفرینی تردد وتامل سے بالاتر ہو کر یقین ہے کہ قطعی طور پر متیقن ہو جائے گی۔

پیشِ نظر کتاب ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' حکیم الاسلام حضرتِ اقدس مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی اسلام کے مزاج اجتماعیت ودعوت پر اُس عمیق ترین نگاہِ بصیرت کی غماز ہے کہ جس نے اُن کو جماعتِ علمائے کرام میں ایک منفرد اور مسلّم مقامِ عظمت پر فائز فرمایا اس لئے دعوتِ دین کے لئے موفق علمائے کرام کیلئے یہ کتاب ایسا متن ہے کہ جو حسب

ظورف واحوال دنیا کے تمام ملکوں، تمام قوموں اور تمام ادیان وملل کے سامنے مؤثر ترین اسالیب پر مشتمل ابلاغِ دین کی انشاء اللہ ایک مکمل راہ نما ثابت ہوگی حق تعالیٰ حضرتِ مصنف قدس سرہٗ کے لئے اس ملت نواحہ عالمگیر دینی خدمتِ عظیم کو قبولیت ومقبولیت عطاء فرمائیں اور بے حساب ترقی درجات کا وسیلہ بنا کر قبول فرمایا۔ آمین یارب العالمین۔

کتب خانہ رحیمیہ دیوبند کی نشاۃ ثانیہ میں عالم گیر فیضان پر مشتمل اس کتابِ عظیم کی شمولیت امید ہے کہ بے حساب برکات وترقیات کا وسیلہ ثابت ہوگی۔

فقط

حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی

مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند

۱۴/۵/۱۴۱۵ھ ۲۰/۱۰/۱۹۹۴ء

یوم الخمیس

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

آج سے تقریباً پچیس سال پہلے احقر نے قرآن حکیم کی آیت دعوت اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ الخ سے اسلامی دعوت و تبلیغ کے بنیادی اصول اور اس کے تحت دعوتی پروگرام کی اساسی دفعات کو بصورت مقالہ ترتیب دیا تھا جس کے بارے میں مختلف اہلِ نظر اور اہلِ علم نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ عربی اور انگریزی زبانوں میں اس کے ترجمہ سے افادہ زیادہ متوقع ہے۔

اس تصور کے عملی ظہور کی ساعتیں پچیس برس کی لمبی مسافت طے کر کے آج ۱۳۸۵ھ میں سامنے آ رہی ہیں جبکہ دارالعلوم دیوبند میں "مجلس معارف القرآن" (اکیڈمی قرآن عظیم) کا قیام عمل میں آیا اور اس نے یہ پیشِ نظر رکھکر کہ قرآن اور اسلام کسی ایک قوم یا خاص ملک اور وقت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک پورے عالم بشریت کے لئے دوامی دستورِ حیات ہے قرآنی حکمت کو ہمہ گیر انداز سے وقت کے تقاضوں کے مطابق دنیا کی ممتاز بین الاقوامی زبانوں میں منظرِ عام پر لانے کا تہیہ کیا۔

مجلس معارف القرآن یہ دیکھتے ہوئے کہ اصول دعوت اسلام کا یہ مقالہ قرآنی علوم کے سرچشمہ سے نکلا ہوا ایک علمی مرقع اور قرآنی مستنبطات کا ایک بصیرت آموز

ذخیرہ ہے جو ادارہ کے موضوع کے عین مطابق ہے اس پر نگاہ انتخاب ڈالی اور اسے مجلس معارف القرآن کی طرف سے شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا بلکہ یہ دیکھتے ہوئے کہ اصول دعوت کا انضباط (جو اس مقالہ کا موضوع ہے) خود دعوت سے بھی مقدم ہے (جو ادارہ کا موضوع ہے) ضروری سمجھا کہ ادارہ کی مطبوعات میں اسے اولیت کا درجہ بھی دیا جائے۔

ادارہ کے ایما پر احقر نے مقالہ پر دوبارہ نظر ڈالی اور تصنیفی نقطۂ نظر سے اس میں کافی ردوبدل اور معتد بہ اضافوں کے ساتھ جدید ترتیب قائم کی جس سے مضمون کے مقاصد اور عنوانات میں خاطر خواہ اضافے ہوئے اور اس کی افادیت خاصی بڑھ گئی چنانچہ سابقہ مقالہ میں اگر آیت دعوت سے تقریباً سولہ سترہ تبلیغی اصول و مقاصد اخذ کئے گئے تھے تو اب اسی آیت سے تقریباً ۴۲ یا اس سے بھی زائد اصول و مقاصد مستنبط ہو گئے جنھیں جامع عنوانات کے تحت منضبط کر دیا گیا اس طرح یہ مقالہ ایک تصنیف بلکہ آیت مذکورہ کی ایک فقہی تفسیر کی صورت سے ادارہ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جس میں انشاء اللہ اسلامی دعوت و ارشاد کا مکمل پروگرام صرف ایک آیت کی روشنی میں سامنے آجائے گا۔

اس تصنیف یا دعوتی فکر کے اس خاکہ کا مقصد محض علمی حد تک ہی نظام دعوت پیش کر دینا نہیں جو کاغذ اور قلم یا زیادہ سے زیادہ ذہنی سطح سے آگے نہ بڑھ سکے بلکہ حقیقی جذبہ یہ ہے کہ ان اصول پر داعیوں کی ایک جماعت تیار ہو جو قرن اولیٰ کے انداز سے غیروں کو اسلام کی دعوت دے اور علمی بصیرت کے ساتھ اقوام عالم کو قرآنی مقاصد سے روشناس کرائے جسے افسوس ہے کہ امت نے تقریباً اس طرح

بھلا دیا ہے کہ گویا وہ اسلامی زندگی کا کوئی موضوع ہی نہیں ہے اور اس طرح آج کی اسلامی امت اپنے فکر و عمل میں بجائے اقدام و ہجوم کے محض دفاعی قوم بن کر رہ گئی ہے درحالیکہ اس امت کا تمام تر آغاز و انجام اقدامی دعوت اور ہجوم کے ساتھ آگے بڑھکر دنیا کو اسلام سے روشناس کرانا تھا تاکہ اسلامی برادری ہر دور اور ہر قرن میں وسیع سے وسیع تر ہوتی رہے اور امر بالمعروف کا نظام عالمگیر ہو جائے نہ یہ کہ وہ مقامیت و محدودیت کی مصداق بن کر رہ جائے اس لئے اس تحریر کا مقصد دعوت اسلام کے بارے میں محض ذہنی شعور پیدا کر دینا نہیں بلکہ ذہنی روشنی اور علمی بصیرت کے ساتھ اس منصب کی ایک فعّال جماعت بھی پیدا کرنا ہے جو طریقِ سلف کے مطابق دینی دعوت کو پوری علمی اور فکری بصیرت کے ساتھ اقوام عالم تک پہونچائے اور اسے موضوعِ زندگی بنا کر اپنے کو اس منصب کے لئے وقف کر دے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

تبلیغِ اسلام کے معنی پشتینی مسلمانوں کو عبادانی رنگ کے کچھ احکام پہونچا دینے اور انھیں وابستہ کر لینے کے نہیں ہیں کہ جس کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ فریضۂ تبلیغ ادا ہو گیا یا اربابِ تبلیغ فرائضِ دعوت سے سبکدوش ہو گئے۔

مجھے اس انداز کی کسی دعوتِ خاص کی ضرورت اور افادیت سے اگرچہ انکار نہیں لیکن اسے فریضۂ تبلیغ سے سبکدوشی سمجھ لیا جانا قرآن کے اصولِ تبلیغ کی روشنی میں یقیناً صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا یہ جزوی تبلیغ تذکیر و اصلاح وغیرہ کے عنوانات سے یاد کی جا سکتی ہے مگر عرفِ شریعت کے لحاظ سے اسے تبلیغ نہیں کہا جا سکتا

اور توسعاً اگر کہا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ تبلیغ احکام کہا جا سکتا ہے (بشرطیکہ احکام و مسائل پہونچائے جائیں) تبلیغ اسلام نہیں کہا جا سکتا کیونکہ عرف شریعت میں تبلیغ درحقیقت اسلام پہونچانے اور اسلامی برادری کے وسیع کرنے کو کہا گیا ہے اس لئے تبلیغ اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے اسلام کا پیغام پہونچانے کا نام ہے۔

صد حیف کہ آج یہ منصوبہ مسلمانوں سے تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اسی لئے اقوام غیر کی نسبت سے ان کی برتری اور فوقیت جس نے انھیں خیر امت بنایا تھا افسانۂ ماضی ہو کر رہ گئی ہے۔ نیز اسی لئے یہ امت اقدامی ہونے کے بجائے جو اس کی اصلی شان تھی محض دفاعی بن کر رہ گئی ہے اور ظاہر ہے کہ دفاعِ محض نہ صرف یہ کہ ارتقاء کا راستہ بند کر دیتا ہے بلکہ زوال و خفا کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتا ہے چنانچہ امت پر محض اس اقدامی صورتِ حال کے ختم ہو جانے سے اقوام کی یلغار ہے، امتیں اس پر ٹوٹی پڑ رہی ہیں اور امت مرحومہ ان یلغاروں کا دفاع کرتے کرتے نہ صرف تھک چکی ہے بلکہ تقریباً مایوسی کا شکار ہے۔

اسے تسلی دینے کے لئے اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کے آج کے عہدِ مقہوریت کیلئے مکہ کی زندگی اسوۂ رسول ہے اور اس کا تقاضا مار یں کھا کر صبر و تحمل سے کام لینا ہے تو غلط بھی ہے اور طفل تسلی سے زیادہ نہیں مکہ کی تیرہ سالہ زندگی بلاشبہ ناتوانی، ضعف و بیکسی اور مظلومیت کی زندگی تھی اور یہ بھی صحیح کہ انھیں ماریں کھا کر اُف نہ کرنے کا حکم بھی تھا کہ وہ ہاتھ کا جواب ہاتھ سے اور زبان کا جواب زبان سے نہ دیں پیٹے جائیں تو پٹ لیں مگر اُف نہ کریں، مصائب پڑیں تو خوشدلی سے جھیل جائیں اور آہ تک نہ کریں لیکن اس کے باوجود مکہ کی زندگی

محض پٹنے اور مار کھانے کی زندگی نہ تھی کہ محض پٹتے رہنے کی زندگی بزدلانہ اور مایوسانہ زندگی ہے جو اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ نہ دفاع ہے نہ ہجوم واقدام بلکہ تعطل ہے جسے اسلام برداشت نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مکہ کی زندگی انتہائی جوانمردی کے ساتھ حملہ آوری اور ہجوم واقدام کی زندگی تھی البتہ یہ حملہ وہجوم مادی اور تیغ وسنان سے نہ تھا جس سے مشرکین عرب کی گردنیں قلم ہو جاتیں بلکہ حملہ ان کی روحوں اور دلوں پر تھا کہ وہ قلم ہو کر دوسری زندگی پائیں جس کا حاصل اعلاءِ کلمۃ اللہ کے تحت انھیں دین پہونچانا اور اسلام کا سیدھا اور سچا راستہ دکھلانا تھا۔ اس اعلیٰ ترین نصب العین (اعلاءِ کلمۃ اللہ) کے تحت ماریں کھانا، پیٹا جانا، مصائب وآفات کا پہاڑ سر پر لے کر اُف تک نہ کرنا اور جان ومال کی قربانی دینا بلاشبہ ہجوم واقدام اور حملہ تھا جو تیغ وسنان کے حملوں سے کہیں زیادہ سخت اور شدید تھا۔ تیغ وتفنگ کے حملوں میں یا حملہ آور یکدم ختم ہو جاتا ہے یا مدِمقابل کو ختم کر ڈالتا ہے یا دونوں ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس معنوی حملہ میں خون اور زخم کا سوال نہیں بلکہ روحوں اور دلوں کے انقلاب کا سوال ہے اس حملہ میں ملک کی فتح سامنے نہیں ہوتی بلکہ جانوں اور قلوب کی فتح پیشِ نظر ہوتی ہے جس میں یک دفعہ کارِ حرب وضرب تمام نہیں ہو جاتا بلکہ حملہ آور کو ہمہ وقت اور مسلسل مقابل افراد کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں جو روح اور بدن دونوں کو مسلسل گھائل بناتی رہتی ہیں مگر حملہ آور برضا وتسلیم انھیں مسلسل برداشت کرتے رہنا اپنا ایمانی فرض سمجھتا ہے۔ سپر تلوار کی جنگ کا ثمرہ اور اس کی سختی آنی ہوتی ہے اور اس دعوت الی اللہ کی روحانی جنگ کے نتائج زمانی ہوتے ہیں جن کا تسلسل قائم رہتا ہے اسی لئے قرآن حکیم نے تیغ وتفنگ

کی جنگ کو اگر جہاد کہا ہے تو اس تبلیغی جنگ کو جہادِ کبیر فرمایا ہے۔ ارشادِ حق ہے

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا — اور قرآن سے ان کا زور شور سے مقابلہ کیجئے

پس مکہ کی زندگی باوجود بے سروسامانی کی زندگی ہونے کے دفاعی یا مدافعت یا محض پٹتے رہنے اور ماریں کھانے کی زندگی نہ تھی بلکہ جہادِ کبیر اور حملہ آوری کی زندگی تھی جس میں ایک بلند اور مضبوط نصب العین کے لئے جان و مال کی قربانیاں پیش کی گئی تھیں۔

پس ماریں کھانا پیٹا جانا اور اس کے ساتھ صبر و تحمل اور عفو و درگذر اگر دعوتِ حق کے سلسلہ میں اقدام کے ساتھ ہو تو وہ قوموں کو گرنے کے بجائے ابھارتا ہے ورنہ محض پٹتے رہنا یا مار کھا کر پھر اگلی بار پٹائی کے لئے پیش ہو جانا نہ صبر ہے نہ تحمل، نہ دفاع ہے نہ ہجوم بلکہ بزدلی، ذلت و خواری اور پستی و دون ہمتی ہے جس سے قومیں ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت میں دفن ہو جاتی ہیں اور جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

یہ مکہ کی زندگی اسی وقت بن سکتی ہے کہ جب یہ مار کھانا اور پیٹا جانا کوئی مضبوط اور پائیدار نصب العین لئے ہوئے ہو جو یقیناً روٹی اور کرسی یا جان بچانا اور کسی خطۂ زمین میں پڑ رہنا نہیں ہو سکتا کہ یہ نصب العین ایک جانور کو بھی میسر ہے بلکہ جان و مال اور عزت و آبرو کو نثار کر دینے کے جذبہ کے ساتھ اعلاءِ کلمۃ اللہ اور دینِ حق کی دولت دوسروں تک پہونچانا ہے جو ایک مستقل اور پائیدار ہجوم و اقدام اور حملہ آوری ہے۔ اس نصب العین کے تحت قوم اگر زندہ رہتی ہے تو اس سے زیادہ عزت کی زندگی دوسری نہیں ہو سکتی اور اگر مٹ جاتی

ہے تو اس سے زیادہ با عزت موت دوسری نہیں ہو سکتی۔

ہم اسے دوسرے عنوان سے یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ مسلم قوم کا کام کسی سے بھیک مانگنا اور دوسرے کے سہارے زندہ رہنا نہیں بلکہ دوسروں کو دینا اور ان کے ساتھ احسان وسلوک کر کے انھیں اٹھانا اور ابھارنا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسروں کو وہی چیز دی جا سکتی ہے جو ان کے پاس نہ ہو اور صرف اپنے پاس ہو اور وہ مستند دین یا سند ہدایت اور خدا کی طرف سے نازل شدہ حق وصداقت ہے جس کا منادی اور داعی ومبلغ بن کر مسلم قوم کو دنیا میں بھیجا گیا ہے پس اگر اس کی زندگی اور موت کا معیار یہ مستند صداقت ہے کہ وہ اسی کے لئے جئے اور اسی کے لئے مرے تو وہ سب سے غنی اور سب کے حق میں محسن ہے لیکن اگر معیار زندگی روٹی، کرسی، جان ومال کی امان جوئی اور حقوق طلبی ہے تو یہ ساری چیزیں چونکہ دوسروں کے پاس زیادہ ہیں اس لئے قوم بہر حال ان کی دست نگر اور محتاج ہو کر ہی زندگی بسر کر سکے گی اور ظاہر ہے کہ محتاج کی زندگی اپنی زندگی نہیں ہو سکتی اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:-

اِنَّكُمْ لَنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَمْوَالِكُمْ	تم دنیا کی اقوام پر مال ودولت سے غالب
وَلٰكِنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَخْلَاقِكُمْ	نہیں آسکتے بلکہ اخلاق (محمدی) سے غالب
(الحدیث)	آسکتے ہو۔

اور یہ محمدی اخلاق یا دینی اور ایمانی ملکات جن میں علم ومعرفت کی حدود اور عمل کی معتدل بنیادیں استوار ہوں وہی دین ہے جو مستند علم اور اخلاق کا مجموعہ ہے اس لئے حدیث نبوی کا صاف مطلب اور منشا یہی نکلا کہ تم اقوام

پر دین سے غالب آسکتے ہو دنیا یا دنیوی عہدوں منصبوں یعنی رسمی شوکتوں کے
منصوبوں اور دولت کے ذخیروں سے غلبہ نہیں پا سکتے اس لئے مسلم قوم کا
غنا اسلامی اور دینی لائن ہی سے قائم ہو سکتا ہے ورنہ اس کے سوا دوسری
صورتوں سے اس کی احتیاج اور پابستگی ہی کی زنجیریں اور زیادہ مضبوط ہو سکتی
ہیں نہ کہ آزادی اور پامردی کی۔

حاصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی دولت ہو یا جاہ وعزت اعلاءِ کلمۃ اللہ ہی
کے راستہ سے اُسے مل سکتی ہے اور اسی لائن سے وہ مؤثر بھی بن سکتی ہے مطلقاً
دولت وشوکت میں وہ ہمیشہ دوسروں سے نیچی رہ کر ان کے سامنے جھکتی ہی
رہے گی اس لئے کہ اس کی عزت خدائی خزانوں سے وابستہ ہے قوموں کی داد و
دہش سے نہیں جو قومیں کسی سے عزت وجاہ کی بھیک مانگ کر زندہ رہنا چاہتی
ہیں وہ کبھی عزت سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں اور جو غنا واستغنا اور غیرت مندی کے
ساتھ اپنی اور اپنے ہی مزاج کی بنیادوں پر اُٹھتی ہیں وہ کبھی ذلت کا منہ نہیں
دیکھ سکتیں۔

حیرت اس پر ہے کہ غنا واستغنا کے خزانوں کے ہوتے ہوئے بھی مسلم
قوم دریوزہ گری کو اپنا نشان بلکہ فخر بنائے ہوئے ہیں اور اقوام کے آگے
ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے۔

اس کا منصبی فرض یہ ہے کہ وہ مصنوعی اور رسمی قسم کے منصوبوں اور نام نہاد
حقوق طلبی سے بالاتر ہو کر استغنا کے میدان میں آئے اور اپنی ساری قوتیں اقوام
عالم کی خیر خواہی میں صرف کرتے ہوئے انھیں راہِ حق دکھانے، دینِ حق پر پہونچانے

اور سبیلِ رب کی دعوت دینے میں منہمک ہو جائے جو اس کا بنیادی فریضہ ہے جس کی وجہ سے وہ خیر امت بنائی گئی ہے۔

قرنِ اولیٰ کی ساری عزتیں اور شوکتیں اسی تبلیغِ دین کے معیار سے ابھریں اور اسی دعوت الی اللہ کے راستہ سے رونما ہوئیں۔ بالاِصالت ان کے سامنے نہ ملکی فتوحات تھیں نہ سعیِ اقتدار اور جاہ طلبی، نہ انھوں نے کبھی کسی قوم سے یہ کہہ کر جنگ کی کہ گدّی ہمارے لئے خالی کرو یا تخت ہمارے لئے چھوڑ دو بلکہ ان کا مطمحِ نظر صرف ایک ہی تھا کہ دنیا کی اقوام ایک ہی ہمہ گیر اور آخری مگر جامع اور مستند دین کے پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں ان کا اقتدار انھیں مبارک رہے۔ اگر وہ دین قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں تو یقیناً اس پر مجبور بھی نہیں ہیں مگر اس صورت میں باعزت مصالحت و مسالمت اور بقاء باہمی کا معاہدہ کریں اور دینی دعوت کے لئے پرامن کھلے راستے چھوڑ دیں تاکہ جن جن قلوب میں سعادۃ کی صلاحیتیں اجاگر ہوں وہ اس کے قبول کرنے پر غور و فکر کر سکیں۔

بہرحال قرنِ اولیٰ کی برگزیدہ قومِ اسی دعوت کے نصب العین سے دنیا میں آگے بڑھی اور آخرت میں فائق ہوئی اس لئے جہاں وہ دین کی روشنی اور نورِ حق کے پھیلانے میں کامیاب ہوئی وہیں اس کے ضمن میں اسے ملک و قوۃ اور شوکت و سطوت بھی ملی جو براہِ راست خود اسے مطلوب نہ تھی بلکہ دین کو مطلوب تھی مگر اس کا ذریعہ وہ تھے جس سے ان کا استغنا اور قوموں کے ساتھ عطاء و جود اور امن و دین کی داد و دہش کا نصب العین اونچا رہا اور وہ دست نگری یا اقوام کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے ہمیشہ بالاتر رہے۔ آج کی امت بھی اسی نقشِ قدم

سے آگے بڑھ سکتی ہے نہ کہ اس سے ہٹ کر کسی دوسری راہ سے۔

کیا مسلم قوم کے لئے اب بھی وقت نہیں آیا کہ وہ اقوام کی دریوزہ گری چھوڑ کر اپنے روایتی استغنا اور غیرتمندی کی بنیادوں پر کھڑی ہو اور اپنے اساسی مقصد (دعوت الی اللہ) کو سنبھالے جس سے اس کی حقیقی برتری کا جلوہ دنیا پھر ایک بار دیکھ لے جو صرف دعوتِ دین ہی کے راستہ سے نمایاں ہو سکتا ہے۔

اس لئے میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اگر سب نہیں تو کم از کم اربابِ علم و بصیرت کی ایک جماعت سارے موہوم منصوبوں کو چھوڑ کر دعوت الی اللہ کے لئے کمر بستہ ہو جائے اور اپنوں سے گذر کر دوسری اقوام کے ساتھ انتہائی خیر خواہی، اعلیٰ ترین شفقت و ملاطفت اور کامل ترین دلداری اور دلپذیر عنوانوں سے انھیں دینِ حق کی طرف مائل کرنے پر لگ جائے اور اس کی زندگی کا واحد نصب العین غیروں کے سامنے اسلام پیش کرنا اور انھیں دینِ حق کی دعوت دینا ٹھہر جائے وہ نہ زری بستیوں منظموں کی فکر میں پڑے اور نہ عہدوں کی الجھنوں میں پھنسے کہ یہ سب تفریق و تخریب کے راستے ہیں بلکہ ایک مرکز بنا کر سادگی و بے تکلفی اور بے غرضی کے ساتھ اپنی ساری صلاحیتیں دعوت الی اللہ میں صرف کرنے کے لئے مستعد اور چست ہو جائے۔

بہر حال اگر مسلمانوں کی آج کی زندگی کو مکی زندگی قرار دیا جا رہا ہے تو مکی زندگی کا عملی نمونہ بھی پیش کیا جائے اور وہ محض ماریں کھانا اور پٹنا نہیں بلکہ پُر امن رہ کر اور ہر قسم کے تشدد سے بچ کر خواہ اس میں ماریں کھانی پڑیں یا جانیں دینی پڑیں تو وہ بلا مقابلہ کے دی جائیں۔

اسی مقصد کو سامنے رکھ کر آیتِ دعوت کی یہ مذکورہ بالا تشریحات پیش

کی گئی ہیں تاکہ دعوت الی اللہ کے آداب و شرائط اور احکام و مسائل کا ایک اجمالی خاکہ ایک ہی آیت کریمہ کی روشنی میں سامنے آجائے اور عملی زندگی میں بیک وقت پیش نظر رکھا جا سکے۔ وباللہ التوفیق

(حضرت مولانا) محمد طیب (صاحب)

مہتمم دارالعلوم دیوبند

یکم صفر المظفر ۱۳۸۵ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دینی دعوت کے قرآنی اُصُول

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی سعادت کا دارومدار دو چیزوں پر ہے صلاح اور اصلاح یعنی خود صالح بننا اور پھر دوسروں کو صالح بنانا، یا خود کمال پیدا کر کے دوسروں کو باکمال کر دینا جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں محض لازمی اور ذاتی نفع پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ اس کو متعدی بنایا گیا ہے کہ ایک سے دوسرے تک پہونچے۔ چنانچہ قرآن و حدیث کی متعدد آیات و روایات اس پر شاہد ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

حقیقتِ صلاح

پھر اس صلاح یا کامل بننے کی بنیاد بھی دو ہی چیزوں پر ہے، علم نافع اور خُلق عادل، علم تو راستہ دکھلاتا ہے اور معتدل اخلاق کی طاقت اُس پر چلاتی ہے جس سے صلاح کی منزلِ مقصود سامنے آجاتی ہے اگر علم نہ ہو تو راہ حق ہی نہیں کُھل سکتی کہ چلنے کی نوبت آئے اور اگر اخلاق میں اعتدال نہ پیدا ہو جو عمل کی مخفی طاقت ہے تو اس کھلی راہ پر چلنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی پس علم محض راہ ہے اور خُلق محض رہبری

کی طاقت اور ظاہر ہے کہ نہ محض راہ سے منزلِ مقصود آتی ہے نہ مطلقاً رفتار سے۔ بلکہ راہ اور رفتار کے اجتماع ہی میں وصول بمنزل کا راز پنہاں ہے اس سے واضح ہے کہ صلاح کی حقیقت تحصیلِ علم اور تعدیلِ اخلاق ہے۔

حقیقتِ اصلاح

اسی سے اصلاح کی حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں کو صحیح علم پہونچانا اور اُن کی اخلاقی حالت درست کرنا ہے، علم پہونچانے کو تعلیم اور اخلاق کے معتدل بنانے کو تربیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس لئے اصلاح کی تمامِ حقیقت تعلیم و تربیت نکل آتی ہے۔

صلاح و اصلاح کی اہمیت

پھر اصلاحِ نفس کے حصول کا ذریعہ تو راہِ علم و اخلاق میں مجاہدہ و ریاضت ہے اور اصلاحِ غیر کا ذریعہ دعوت و ارشاد اور تبلیغ و موعظت ہے اسلئے تکمیلِ سعادت کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ خود عالم باعمل بن کر دوسروں کو دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے عالم و عامل بنایا جائے، پس انسان صلاح و رُشد کے کتنے ہی اعلیٰ مقام پر کیوں نہ پہونچ جائے لیکن جب تک وہ اپنی استطاعت کے مطابق یہ صلاح و رُشد اپنے بھائیوں تک پہونچانے کا اہتمام نہ کرے گا اس وقت تک وہ اپنا ذمہ بری نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے جہاں اپنے پیرُوؤں کو اُن کی ذاتی تہذیب و شائستگی کے لئے علم و عمل اور اعتقادات و اعمال کے ایک جامع پروگرام پر کاربند رہنے کا حکم دیا ہے وہیں اُن کے لئے اس پروگرام کی تبلیغ

ودعوت اور ارشاد و تلقین کا حکم محکم بھی صادر فرمایا ہے تاکہ ایک کے ذریعہ دوسرا مہذب اور شائستہ بن سکے۔

پس اگر اعتقاد توحید و رسالت اور عام عبادت و ریاضت نماز، روزہ حج، جہاد اور احسان وصلہ وغیرہ اس وجہ سے فرض ہیں کہ قرآن وحدیث نے ان کا امر صریح کیا ہے تو دعوت و ارشاد اور موعظت و نصیحت بھی اسی لئے فرض قطعی ہے کہ کتاب وسنت ہی نے اس کا بھی صریح اور غیر مشتبہ حکم دیا ہے جس کے بارہ میں کتنی ہی آیات و روایات وارد ہوئی ہیں ان بیسیوں نصوص میں سے آیات ذیل کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں دعوت الی اللہ کے حکم قطعی کے ساتھ حسب فہم احقر اس منصب دعوت کے آداب وشروط اور بنیادی ضوابط و قواعد یا دستور العمل پر بھی اصولی حیثیت سے ایک گہری اور جامع و مکمل روشنی ڈالی گئی ہے جو اس وقت ان مختصر اوراق کا موضوع بحث اور مقصود بیان ہے اس طرح ہمارا موضوع بحث قرآنی دعوت اور اس کی قرآنی تشریح قرآن ہی سے متعین ہو جاتا ہے جس کی تفصیل آیت دعوت کی روشنی میں حسب ذیل ہے۔

اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجئے، جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے دل تنگ نہ ہوجیئے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور جو نیک کردار ہوتے ہیں۔

دعوتی پروگرام کی اجمالی تعیین قرآن سے

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ۝ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۝ (ربما سورۂ نحل)

ترجمہ:۔ آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجئے آپ کا رب اس شخص کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کے راستہ سے گم ہوا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے اور مخالفوں کے جواب میں اگر سختی کرو تو چاہیئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی ہے اور اگر تم نے صبر کیا (یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہ دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کیلئے صبر ہی بہتر ہے۔

مقاماتِ دعوت اس آیت میں اولاً حضرت سید الداعین صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً اُمت کے عام منصب یافتگانِ دعوت و تبلیغ کو دعوت الی اللہ کا حکم دیا گیا ہے، یہ فعل دعوت الی اللہ جو

صیغۂ اُدع سے مفہوم ہو رہا ہے چونکہ متعدی فعل ہے اس لئے اسے سب سے پہلے تو فاعل کی ضرورت ہے جسے "داعی" کہا جائے گا پھر مفعول کی جسے "مدعو" کہیں گے اور پھر اس چیز کی جس کی طرف دعوت دی جائے جسے "مدعوالیہ" سے یاد کیا جائے گا۔ اس طرح اس صیغۂ اُدعُ سے چار مقام پیدا ہو جاتے ہیں دعوت، داعی، مدعو، مدعوالیہ۔ جن کی تشریح سے ہی فی الحقیقت منصب دعوت وارشاد کی تشریح ہو سکتی ہے۔ دعوت کا کلمہ اُدع سے نکلنا ظاہر ہے کیونکہ اُدع فعل ہے اور ہر فعل کیلئے ایک مادہ ضروری ہے جس سے وہ بنایا جائے اور مشتق ہو، ظاہر ہے کہ فعل اُدع کا یہ مادہ دعوت ہی ہے جس سے یہ صیغہ بنا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ فعل ہو اور اس کا مادہ اس میں نہ ہو کہ فعل تو اس مادہ کی محض ایک صورت ہوتا ہے۔ اگر مادہ نہ ہو تو صورت کس چیز پر کھینچی جائے اس لئے کلمہ اُدع سے دعوت کا نکلنا محض فنی قواعد ہی پر مبنی نہیں بلکہ عقلاً بھی ضروری ہے اور جب فعل دعوت آیت کی عبارت سے ثابت ہے تو داعی، مدعو اور مدعوالیہ کا ثبوت قدرتی طور پر خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی فعل بغیر فاعل کے نہیں ہو سکتا پس کوئی دعوت بغیر داعی کے نہیں ہو سکتی اور کوئی داعی بغیر اپنے مخاطب یعنی مدعو کے داعی نہیں کہلایا جا سکتا اور پھر کوئی داعی اور مدعو بغیر اس شئے دعوت کردہ یعنی مدعوالیہ کے داعی مدعو نہیں بن سکتے کہ اسی کی وجہ سے تو وہ داعی مدعو کہلاتے ہیں اس لئے یہ چاروں مقامات دعوت، داعی، مدعو، مدعوالیہ جن پر ہمیں بحث کرنی ہے نصِ آیت ہی سے صاف طور پر نمایاں ہو جاتے ہیں کوئی عبارت نص سے اور کوئی دلالت و اقتضاء نص

سے اور کوئی اشارت نص سے

چار ارکانِ دعوت کے چار مصداق قرآن سے

(۱) پھر چونکہ اس فعل دعوت الی اللہ کا خطاب حق تعالیٰ کی طرف سے اوّلاً حضورؐ کو ہے اس لئے بدلیلِ تخاطب اس دعوت کے داعیٔ اول اس آیت کی رُو سے حضورؐ ہوں گے اور پھر امت کے تمام وہ منصبداران دعوت و تبلیغ جو آپؐ کے اس نقش قدم پر چل رہے ہوں پس اس لئے اس فعلِ دعوت کے داعیوں کی تعیین بھی اسی آیت سے ہو جاتی ہے۔

(۲) ادھر جبکہ آپ کی دعوت کسی قوم و ملت کے لئے خاص نہیں بلکہ بتقاضائے اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا یعنی میں تم سب انسانوں کی طرف رسول (پیام الٰہی پہونچانے والا) ہوں۔ سارے عالم کے لئے عام ہے اور اسی لئے اس بارہ میں آیت مطلق ہے کسی خاص قوم و ملک سے مقید نہیں کہ صرف اُسی کو دعوت دی جائے اس لئے مدعو دنیا کی ساری اُمتیں ہوں گی اور وہ سب بلحاظِ دعوتِ عامہ آپ ہی کی اُمت کہلائیں گی اسی لئے اصطلاحی الفاظ میں دورۂ محمدی کی تمام اقوام و ملل کے مجموعہ کو امتِ دعوت کہا گیا ہے پس بظاہر اس مفعول (یعنی عام مدعوین) کا عبارتِ آیت میں کوئی تذکرہ نہیں لیکن اگر قواعدِ عربیّت کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ تذکرہ نہ ہونا ہی ان مدعوّین کا سب سے بڑھ کر تذکرہ ہے کیونکہ جب مفعول میں کوئی تخصیص پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ تعمیم اور اطلاقِ عام ملحوظ ہوتا ہے تو مفعول کو لفظوں میں ذکر نہیں کرتے پس جبکہ

یہاں دعوت کا ذکر کر کے مدعو کا ذکر چھوڑ دیا گیا تو عربی قواعد کے مطابق یہ اس کی دلیل ہے کہ اس دعوت کا مدعو کوئی خاص فرد یا قوم نہیں بلکہ ہر وہ فرد و بشر ہے جس میں خطاب کو سمجھنے کا مادہ موجود ہے اس لئے مدعو کے دائرہ میں تمام اقوام عالم کا متعین ہونا بھی اسی آیت سے ثابت ہو گیا۔

(۳) ادھر اس پروگرام کی تعیین بھی جس کی طرف دعوت دی جائے یعنی مدعو الیہ صراحۃً الفاظ آیت سے ہو رہی ہے کہ وہ سبیل رب ہے اس لئے مدعو الیہ یعنی دعوت کردہ چیز بھی قرآن حکیم کی اسی آیت سے ثابت اور متعین ہو گئی۔

(۴) پھر اسی سبیلِ رب کے کلمہ سے فعلِ دعوت کی نوعیت بھی خود ہی متعین اور مشخص ہو جاتی ہے کہ شریعت پہونچانے یعنی تبلیغ کرنے کا نام فعلِ دعوت ہے مطلقاً کسی نہ کسی بات کے پہونچا دینے یا کسی نہ کسی معقول یا اچھی بات کے کہہ دینے کا نام دعوت نہیں ورنہ اُدْعُ کے بعد سبیلِ رب کا کلمہ نہ لایا جاتا بلکہ اُدْعُ پر قناعت کر لی جاتی تو اس میں عموم رہتا کہ جو چاہو پہونچا دو وہی فعلِ دعوت اور اُدْعُ کی تعمیل ہو گی مگر جب اس فعل کو سبیلِ رب سے مقید کر دیا گیا تو واضح ہو گیا کہ محض کسی نہ کسی چیز کے پہونچا دینے کا نام فعلِ دعوت نہیں بلکہ صرف سبیلِ رب اور شریعت پہونچانے ہی کے فعل کو فعلِ دعوت کہا جائے گا۔ اس لئے فعلِ دعوت کی تشخیص بھی اسی آیت کریمہ سے ثابت ہو گئی۔

بہر حال یہ چاروں مقاماتِ دعوت (داعی، مدعو، مدعو الیہ اور پھر ان چاروں کے مصداق جو یہاں مراد ہیں نصِ آیت ہی میں مذکور اور اس سے ثابت شدہ نکلتے ہیں فرق ہے تو یہ کہ دعوۃ و داعی اور مدعو الیہ کا تذکرہ تفصیل اور تعیین کے ساتھ

الفاظِ کلام اور عبارت نص میں موجود ہے اور مدعوین یعنی اقوام و ملل کا ذکر الفاظ میں نہیں مگر الفاظ کی دلالت میں موجود ہے جس سے مدعوین کا عموم ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اگر لفظوں میں یہ کہا جاتا کہ فلاں فلاں تو میں اس دعوت کی مدعو ہیں تو عمومِ دعوت باقی نہ رہتا بلکہ صرف وہی اقوام مدعو شمار ہوتیں جن کا ذکر آیت میں کیا جاتا حالانکہ یہ عمومِ دعوت قرآن حکیم کی دوسری صریح آیات سے قطعی طور پر ثابت ہے، اور اگر لفظوں میں تمام اقوام کا ذکر کیا جاتا تو بیشک عمومِ دعوت تو واضح ہو جاتا مگر عبارت خلافِ بلاغت ہو جاتی کیونکہ قواعدِ عربیت و بلاغت کی رُو سے ایسے مواقع میں سکوت ہی کلام کے قائم مقام ہوتا ہے جس سے مفہوم میں اطلاق پیدا ہو جاتا ہے اور مختصر تعبیر سے وہ پورا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جو طویل عبارت سے ہوتا اس لئے مدعوین کا تذکرہ ضمنِ کلام میں فرما دیا جانا کافی سمجھا گیا اس طرح دلالتِ آیت سے مدعوین بھی اسی آیت سے مشخص ہو گئے

اسی کے ساتھ مدعوین کو سکوت سے بیان کرنے اور دعوت و داعی اور مدعوا لیہ کو صریح الفاظ میں ذکر کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس آیتِ دعوت کا مقصودِ اصلی مدعوین کی اصلاح و ہدایت ہے اور اس ہدایت و اصلاح کا دارومدار درحقیقت دعوت کی خوبی، داعی کی قابلیت اور دعوتی پروگرام کی مقبولیت پر ہے یعنی پروگرام جاذبِ توجہ ہو جو مدعو کو اپنی طرف کھینچ لے، دعوت دل آویز ڈھنگ سے ہو کہ مدعو کو جانے نہ دے، داعی کا کیرکٹر معیاری ہو جو مدعو پر اثر ڈال سکے اس لئے اگر فی الحقیقت ضرورت تھی تو زیادہ تر انہی تین چیزوں کے آداب و اوصاف کی تفصیل کی تھی تاکہ مدعو کو کامل ہدایت حاصل ہو جائے

مدعو کوئی خاص فرد یا طبقہ معین ہی نہ تھا کہ اس کی تعیین و تفصیل کی ضرورت پڑتی اس لئے حق تعالیٰ نے مدعوین ہی کی معلومات سے (جو اس آیت کا اصل مقصد ہے) آیت میں دعوتی پروگرام پھر دعوت الی اللہ کے انواع و اقسام اور اُن کے رنگ ڈھنگ اور پھر دعوت دہندوں کے مخصوص احوال و اوصاف پر خصوصی اور گہری روشنی ڈالی ہے اور ضمنی طور پر مدعوین کے خاص اوصاف کی طرف بھی کچھ اشارے فرما دیئے ہیں جس کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ:

(۱) دعوتی پروگرام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مدعوین تک پہونچنے کی صلاحیت ہو۔

(۲) دعوت کی خوبی یہ ہے کہ وہ مدعو اور مخاطب کے مناسب حال ہو۔

(۳) داعی کی خوبی یہ ہے کہ اس کا علمی اور اخلاقی معیار بلند ہو۔

(۴) مدعو کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قبول کا جذبہ موج زن ہو

انہی چہارگانہ مقاصد کی تفصیلات پورے مالہ و ماعلیہ کے ساتھ اس آیتِ دعوت میں بیان فرمائی گئی ہیں ہم ذیل میں انھیں تفصیلات کی تشریح پیش کریں گے۔

(۱) مدعوالیہ یعنی دعوتی پروگرام

۱۔ طبعیات

دعوتی پروگرام کے سلسلہ میں جس کی طرف لوگوں کو بلایا جائے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مخاطب کے حق میں کوئی طبعی اور ذاتی چیز نہ ہو بلکہ ایک بیرونی اور اتفاقی چیز ہو جسے تبلیغ کے ذریعہ اس میں اتارا جائے ورنہ اگر وہ مخاطب کے جذر طبیعت میں پہلے ہی سے موجود ہے تو تبلیغ و دعوت کی حاجت ہی باقی نہیں رہتی کہ یہ تحصیل حاصل ہوگی۔

اس اصول کے ماتحت طبعیات دائرۂ تبلیغ سے خارج ہو جاتے ہیں کہ ان کی طرف رہنمائی انسان کی پیدائشی طبیعت خود بخود کرتی ہے خواہ کوئی ہادی آئے یا نہ آئے مثلاً کھانا، پینا، سونا، جاگنا، رغبت و نفرت، رونا، ہنسنا، بولنا، چالنا، چلنا پھرنا اور قضائے حاجت وغیرہ انسان کے ایسے طبعیاتی امور ہیں جو بتقاضائے طبع خود بخود اُس سے سرزد ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی ایک انسان کا بچہ یہ ساری چیزیں اپنے طبعی داعیہ سے از خود کرنے لگتا ہے گویا سیکھا سکھایا پیدا ہوتا ہے اس لئے ان امور میں اسے نہ کسی معلم کی حاجت ہے نہ داعی و مبلّغ کی۔

۲۔ عقلیات

اسی طرح عقلیات کے سلسلہ میں بھی تبلیغ و دعوت کی ضرورت نہیں ہوسکتی کہ عقل تھوڑی ہو یا بہت ہر انسان میں موجود ہے اور ہر ایک انسان جب تک کہ وہ دیوانہ نہیں ہے بغیر کسی مُعلّم عقل

کے خود بخود اپنے دماغ پر بوجھ ڈال کر عقل ہی کی کہتا ہے اور عقل ہی کی بات باور کرتا ہے۔ بجز عقلی اختراعات میں عقل ہی کے دباؤ سے بقدر بساط حصہ لینے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ دھواں دیکھکر آگ کا یقین کر لینا، نقش قدم دیکھکر گذرنے والے کا یقین کر لینا، تری دیکھکر پانی کے قرب کا یقین کر لینا وغیرہ وہ عقلی باتیں ہیں جن کے لئے کسی معلم یا مبلغ کی ضرورت نہیں عقلی رہنمائی کافی ہے۔ اسی لئے عقلیات میں تقلید نہیں، ہر شخص کو رائے زنی کا حق ہے۔ پھر اگر بڑی عقل والے کم عقل کے کلام کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے اور اپنا کوئی نقصان اس میں محسوس نہیں کرتے تو ہو سکتا ہے کہ کم عقل والے بھی کسی بڑی عقل والے کی خلاف ورزی میں اپنا کوئی ضرر محسوس نہ کریں کیونکہ ضرر کا تعلق احساس سے ہے کم عقل جب اس بعید ضرر کا وہ احساس ہی نہیں رکھتا جو کبیر العقل رکھتا ہے تو یہ ضرر اس کے لئے تکلیف دہ ہی نہیں بن سکتا اگر بن سکتا ہے تو اُس بڑی عقل والے کے لئے جسے اس ضرر کا احساس تھا۔ اس بنا پر بدیہیات کی طرح عقلیات میں بھی تبلیغ کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

۳۔ حسیات رہ گئے حسیات تو وہ بھی کسی تعلیم و تلقین کے محتاج نہیں اگر آنکھ کان یا ناک سے کوئی چیز دیکھنے، سننے اور سونگھنے کی ہے تو آنکھ ناک، کان کھول کر آدمی خود ہی اسے محسوس کرے گا بشرطیکہ اندھا، بہرا اور بجیس نہ ہو یہ نہیں کہ کوئی اسے تبلیغ کرے تب وہ کھلی آنکھوں دیکھے ورنہ اسے کچھ نظر نہ آئے۔ بہر حال حواس اپنے کام میں کسی داعی اور معلم کے محتاج نہیں صرف اُن کا کھلا ہونا اور شئی محسوس کا موجود ہونا شرط ہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ جو چیزیں انسان

کے اندر طبعی یا عقلی یا حسی ہیں جو اس میں پہلے ہی سے پورے تقاضوں کے ساتھ موجود ہیں ان میں نہ دعوت کی حاجت ہے نہ تبلیغ کی ضرورت اس لئے دعوت و تبلیغ کا ان امور سے تعلق نہیں۔

بہرحال جبکہ محسوسات، طبعیات اور عقلیات تبلیغ سے مستغنی ہیں تو یہ امر واضح ہوگیا کہ تبلیغ صرف ایسے ہی مقاصد کی ہو سکتی ہے جو انسان میں دعوت و تبلیغ اور تلقین ہی سے پیدا ہو سکتے ہوں اور پہلے سے اس کے اندر نہ ہوں۔

۴۔ شرعیات

اس لئے غور طلب یہ رہ جاتا ہے کہ یہ بیرونی مقاصد جو انسان میں پہونچائے جائیں کہاں سے لائے جائیں؟

ظاہر ہے کہ انسان کے سوا کسی دوسری مخلوق کے دائرہ سے لاکر تو انسان میں ڈالے ہی نہیں جا سکتے کیونکہ اس دائرہ کی سب سے برتر اور اکمل نوع تو خود انسان ہی ہے اور وہ جب خود اپنے ہی نوع کے ذاتی امور عقل طبع اور حس وغیرہ میں ایک دوسرے کا مکلّف نہیں تو اپنے سے اَرذل و کمتر انواع جمادات نباتات حیوانات کی ذاتیات کا کب مکلف ہو سکتا ہے کہ یہ کم رتبہ چیزیں اسے تبلیغ کریں اور اسے حدِّ کمال پر پہونچائیں، نیز جو باتیں ان انواع میں موجود ہیں جیسے جمادات کی جمادیت (سختی نرمی وغیرہ) نباتات کا نشو و نما حیوانات کا حس و شعور وہ سب انسان میں بھی موجود ہیں اور طبعی ہو کر پائی جاتی ہیں تو پھر ان کی تبلیغ کی حاجت ہی کیا ہو سکتی ہے اور وہ بھی اپنے سے ارذل و کمتر کے ذریعہ اگر پھر بھی وہ ان سے مستفید ہونے لگے تو یہ تکمیل نہ ہوگی بلکہ تنقیص ہوگی جسے تبلیغ نہیں کہہ سکتے کہ تبلیغ تکمیل کے لئے ہوتی ہے نہ کہ تنقیص کے لئے۔ اس سے

ظاہر ہے کہ تبلیغ لامحالہ ایسے ہی امور کی ہو سکتی ہے جو نہ خود انسان کے اندر ہوں نہ دوسری مخلوقات سے اس میں لائے جا سکتے ہوں گویا پوری مخلوقات ان سے خالی ہو تو قدرتی طور پر اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ تبلیغی امور انسان کے خالق کی طرف سے اس میں آسکتے ہوں جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ مخلوقات کی ذاتیات یعنی عقل و طبع اور حس کے بجائے صرف خالق کی ذاتیات یعنی علوم کمالات معارف و حقائق اور اخلاق و صفات ربانی ہی کی تبلیغ کی جائے گی تاکہ وہ حد کمال پر پہونچایا جا سکے اب اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ نکلا کہ تبلیغ نہ حسیات کی ہو سکتی ہے نہ طبعیات کی اور نہ ہی عقلیات کی بلکہ صرف شرعیات کی ہو سکتی ہے جو خالق سے منقول ہو کر انسان تک پہونچیں کہ شرعیات کے سوا تمام چیزیں انسان میں قبل از تبلیغ خود بھی تقاضائے طبع سے موجود ہوتی ہیں۔

البتہ ان طبعی اور عقلی و حسی اُمور کے استعمال کرنے کے طریقے، اُون کے حدودِ استعمال، اُون کی مقدارِ استعمال اور ساتھ ہی اُون کے مواقعِ استعمال کہ کہاں آنکھ ناک، کان کو استعمال کیا جائے اور کہاں نہ کیا جائے، کتنا کیا جائے اور کتنا نہ کیا جائے، معقولات پر کہاں کہاں دھیان دیا جائے اور کس حد تک دیا جائے وغیرہ وہ امور ہیں جو انسان کی طبیعت میں خود سے موجود نہیں بلکہ ان میں بیرونی علم کی ضرورت پڑتی ہے جو انسان کی ذات میں موجود نہیں اس لئے اس حد تک یہ امور بھی شرعی اور محتاج تعلیم و تلقین ہو جاتے ہیں پس شریعت کا کام نفس حسیات طبعیات اور عقلیات کی تفاصیل بیان کرنا نہیں بلکہ اون سے متعلقہ احکام کا بیان کرنا ہے جن سے انسان کی طبیعت اور عقل و حس خالی ہے

قابلِ تبلیغ صرف علمِ آلٰہی ہے

بہر صورت تبلیغی چیز صرف علمِ آلٰہی نکلا جسے علم شرعی کہا جاتا ہے اور اس لئے یہ واضح ہو گیا کہ دعوتی پروگرام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ خدا کی طرف سے ہو مخلوقاتی دائرہ کی چیز نہ ہو کہ مخلوق کی طرف سے جو علم وفن بھی ہوگا وہ محض طبعیاتی یا عقلیاتی دائرہ کا ہوگا جس کے لئے انسان تبلیغ کا محتاج نہیں اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ دعوتی پروگرام کی اولین خصوصیت تشریعیت ہونی چاہیئے کہ وہ منجانب اللہ ہو منجانبِ خلق نہ ہو اور ظاہر ہے کہ منجانب اللہ جو چیز منتقل ہوتی ہے وہ علم وہدایت ہی ہے اس لئے دعوتی پروگرام کے سلسلہ میں داعی اور مبلغ کا مقاصدِ تبلیغ کے حق میں عالم اور باخبر ہونا ضروری ٹھہرتا ہے محض لسّانی اور بولتا ہونا کافی نہیں۔

جاہلِ محض اور شرعی ذوق سے بے بہرہ حقیقی داعی یا منصبِ دعوت کا اہل نہیں ہو سکتا اور خواہ مخواہ بن بیٹھا تو لوگوں کے لئے گمراہی کا سبب اور خطرۂ ایمان بنے گا جیسے نیم حکیم خطرۂ جان ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی روک تھام یا مشکل ہوگی یا فتنہ کا سبب بن جائے گی۔

جیسا کہ آج اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے بہت سے لسّان مگر جاہل واعظ تبلیغی اسٹیجوں پر اُچھلتے کودتے نظر آتے ہیں جو اپنے ذہنی تخیلات کو بر رنگِ شریعت پیش کر کے مخلوقِ خدا کو گمراہ کر رہے ہیں جس سے عوام میں دھڑے بندیاں قائم ہو رہی ہیں اور امت کا کل بجائے متحد ہونے کے زیادہ سے زیادہ منتشر ہوتا چلا جا رہا ہے جس سے امت اجتماعی لحاظ سے کمزور اور بے وقار ہوتی جا رہی ہے جو تبلیغ کے

حق میں قلب موضوع ہے۔ محض اس لئے کہ اس قسم کی تبلیغ صحیح عالم اور صحیح علم سے محروم ہوتی ہے اس لئے دعوتی پروگرام کی اساس و بنیاد علم الٰہی کے سوا دوسری چیز نہیں ہو سکتی جو تشریعیت کا پہلا مقام ہے۔

غور کیجئے تو اس مدعوالیہ یعنی دعوتی پروگرام کی یہ خصوصیت اس آیت دعوت سے صاف نکل رہی ہے کیونکہ آیت میں مدعوالیہ کی تعیین سبیل رب کے کلمے سے کی گئی ہے کہ خدا کے راستہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور خدا کا راستہ وہ ہی شرعیاتی راستہ ہے جو اس کے علوم و کمالات اور اخلاق پر مشتمل ہے جیسا کہ ابھی واضح ہوا اس لئے مدعوالیہ کے سلسلہ کا ایک مقام آیت دعوت سے حل ہو گیا۔

بدعات کی تبلیغ جائز نہیں

نیز جبکہ عبارتِ آیت میں منطوقاً امر کیا گیا کہ تبلیغ خدا کے راستہ کی کرو اور خدا کا راستہ وہی شریعت یا شرعیاتی پروگرام ہے جو اخلاقِ ربانی اور علمِ الٰہی پر مشتمل ہے تو اسی آیت کے مفہوم سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ غیر خدا کے راستہ کی طرف شرعیاتی دعوت مت دو اور غیر خدا کا راستہ وہ ہی خالص طبعیاتی یا عقلیاتی پروگرام ہے جو ہر انسان کی طبیعت سے خود بخود ابھرتا ہے جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ دین کے نام پر اختراعات و محدثات اور بدعات کی تبلیغ جائز نہیں کہ وہ خدا کے راستہ کا پروگرام ہی نہیں وہ سبیل رب ہونے کی بجائے سبیلِ نفس یا سبیل خلق ہے جو عموماً مذہبی لوگوں کے غلو و تعمّق نظر اور تکلّف سے پیدا ہوتا ہے پس داعی اور مبلغ کو ہر مسئلہ کی تبلیغ سے پہلے اس پر غور کر لینا چاہئے کہ جس مسئلہ کی وہ تبلیغ کر رہا ہے آیا وہ شرعی ہے بھی یا نہیں؟ اور آیا شریعت کی معتبر اور مستند کتابوں

میں اس کا وجود ہے یا نہیں؟ یعنی کسی مسئلہ کا محض زبان زد ہو جانا رواج پکڑ جانا یا مطلقاً کسی کتاب میں طبع ہو جانا اس کے شرعی ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُن ثقاتِ اہلِ شریعت کی زبان و قلم سے اس کی تصدیق و تائید اور نقل و روایت نہ ہو جن کا رات دن کا مشغلہ شرعیات کی تعلیم اور شرعی کتب میں تفکر اور ردّ و کد ہو غرض داعی الی اللہ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے دعوتی پروگرام کو لوگوں کے نفسانی اختراعات و جذبات یا اہلِ تعمق اور اربابِ غلو کے تراشیدہ رسوم اور آلائشوں سے پاک کر کے اصلی اور سادہ دین پیش کرنے اور خالص وحی کی تبلیغ کرے جو منقول ہو کر ہم تک پہونچتی ہے کیونکہ مکمل وحی آجانے کے بعد اختراع کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہتا کہ بدعات کی تبلیغ جائز رکھی جائے بلکہ صرف اتباع کا درجہ باقی رہ جاتا ہے لہذا موضوع اور منکر روایات، زبان زد اسرائیلیات من گھڑت قصے کہانیاں۔ ہنسی اور ٹھٹے کی باتیں جو عموماً پیشہ ور واعظوں کا پیشہ بن گئی ہیں سبیلِ رب کے لفظ۔ مے سب ممنوع ٹھہر جاتی ہیں جن سے مبلغ کو احتراز کرنا ضروری ہے ورنہ وہ اسلام کی نہیں بلکہ اسلام میں سنّتِ جاہلیت کی اشاعت کا مرتکب ہوگا جس سے اس کی یہ تبلیغ بجائے مفید ہونے کے مضر اور بجائے امن و سکون قائم کرنے کے فتنہ کا ذریعہ ثابت ہوگی جو مختلف قسم کے نزاعات و مجادلات اور فرقہ بندیاں پیدا کر دے گی جن سے امت میں کمزوری آجانا ایک امرِ طبعی ہوگا جیسا کہ آجکل پیشہ ور لیکچراروں اور خود غرض خطیبوں کی تبلیغی نمائشوں سے نمایاں ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تبلیغ کے ہونے سے اس کا نہ ہونا بہتر ہے۔

بہر حال شرعیات کی تبلیغ آیت کے منطوق سے ضروری نکلی اور غیر شرعیات کی تبلیغ اسی آیت کے مفہوم سے ممنوع ثابت ہوگئی۔

دعوتی پروگرام کی سادگی اور بے تکلفی

نیز اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ تبلیغی مسائل میں ایک گونہ بے تکلفی بھی ملحوظِ خاطر رہنی چاہیئے کیونکہ سبیلِ رب کی تبلیغ میں تو صرف نقل کی ضرورت ہو سکتی ہے جس میں کسی تکلف کی قطعاً حاجت نہیں اور غیر سبیلِ رب میں اختراع و ایجاد کی ضرورت ہے جس کی بنیاد ہی تکلف پر ہے گویا بدعت تو بنائی پڑتی ہے جس کا حاصل تصنّع ہے اور سنّت بنی بنائی چیز ہے جس کا صرف نقل کر دینا کافی ہے نہ اس میں تکلف درکار ہے نہ تصنّع، پس جو مبلّغ حقیقتاً خدا کا راستہ دکھلائے گا اس کے مقاصد اور بیانات میں سادگی اور بے تکلفی ہوگی اور جو لوگوں کو بجائے سبیلِ رب کے اپنی طرف بلائے گا اسے اپنے بیانات میں یقیناً طرح طرح کے تکلفات، تصنعات اور بناوٹوں کو دخل دینا پڑے گا مثلاً تقریر کے نرالے ڈھنگ اختیار کرنا، آواز میں مصنوعی اتار چڑھاؤ اور انداز پیدا کرنا، ہیئت میں خاص خاص بناوٹیں دکھلانا، اسٹیج پر بَن کر آنا، خاص انداز سے بولنا، تھیٹر کے سے ڈراموں کی نقلیں اتارنا، الفاظ میں قافیہ اور سجع کی رعایت بتکلف کرنا وغیرہ وغیرہ جس سے سامعین کی توجہات اپنی طرف جذب کی جاسکتی ہوں۔

غرض اپنے کو یا اپنے بیان کو بنانا محض تصنّع اور بناوٹ ہے اور اس سادگی کے منافی ہے جو سبیل رب کے جملہ سے نکل رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تکلفات آیت کے اس جملہ سبیلِ ربّ سے ممنوع اور مذموم ٹھہرتے ہیں اور اس سے

واضح طور پر تبلیغ کے تکلف و تصنع کی نفی نمایاں ہے جو آجکل کے پیشہ ور واعظوں اور خود رو لیڈروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ خاص تبلیغ ہی کے سلسلہ میں اس تصنع کی کھلی نفی بھی فرمائی ہے ارشاد حق ہے

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ○

ترجمہ :- (اے رسول) آپ کہدیجئے کہ میں تم سے اس قرآن کی تبلیغ پر نہ کچھ معاوضہ چاہتا ہوں اور نہ بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں (اس لئے کہ) یہ قرآن تو اللہ کا ذکر ہے اور ذکر الٰہی میں بناوٹ کی حاجت ہی نہیں وہ تو بنی بنائی چیز ہے جو اوپر سے اتار دی گئی ہے۔

دعوتی پروگرام کی جامعیت

اسلام ہی تبلیغی مذہب ہے

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ دعوتی پروگرام صرف سبیل رب اور وحی ہو سکتی ہے کہ جس میں نہ اختراع ہو نہ بدعت، نہ تکلف ہو نہ تصنع، اب اس پر غور کرنا چاہیئے کہ آیا اس وحی میں تبلیغ اور ساری اقوام میں پھیل جانے کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں؟ اور آیا یہ وحی کسی خاص قوم اور خاص وطن کے لئے تو نہیں آئی؟ کیونکہ اگر کسی پروگرام میں ذاتی طور پر عمومیت اور ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہو کر اجتماعی دستور العمل بننے کی صلاحیت ہی نہ ہو بلکہ وہ کسی قومیت یا وطنیت کے لئے مخصوص ہو تو ظاہر ہے کہ وہ پروگرام تبلیغی کہلایا ہی نہیں جا سکتا کہ اس کے لئے تبلیغ و دعوت اور آداب تبلیغ کا کوئی نظام زیر غور آئے۔ قرآن کریم نے ایسے پروگراموں کی طرف بھی اشارے فرمائے ہیں جو کسی قومیت کے لئے مخصوص ہوں۔ فرمایا گیا

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (پارہ ۱۳ سورۂ رعد آیۃ ۷) ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کنندہ آیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب قوم، قوم کے لئے الگ الگ ہادی آئے تو ہر ایک ہادی اپنی ہی قوم کا ذمہ دار بھی بن کر آیا ہے جس کے صاف معنی یہی نکل سکتے ہیں کہ اس کا تبلیغی پروگرام بھی اسی کی قوم کے لئے مخصوص تھا ورنہ اسے کسی مخصوص قوم کا ہادی نہ فرمایا جاتا اور اس کی تبلیغ اسی کی قوم کے دائرہ تک محدود نہ رہتی۔

ظاہر ہے کہ ایسے قومی پروگراموں میں جن میں قومیت کی حد بندیاں قائم ہوں تبلیغِ عام کی صلاحیت اور ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہونے کی قابلیت ہی نہیں ہوتی کہ اُسے عمومی تبلیغ کا مسلک کہا جائے اگر ایسے مخصوص پروگراموں کو خواہ مخواہ دوسری اقوام تک پہونچانے کی کوشش بھی کی جائے گی تو وہ یقیناً بیچ ہی میں رہ جائیں گے یعنی وہ دوسری اقوام تک ان کے مناسب مزاج نہ ہونے کے سبب پہونچ نہ سکیں گے ہاں اپنی قوم سے ضرور منتقل ہو جائیں گے جس سے یہ مبلغ قوم تو پروگرام سے خالی ہو جائے گی اور دوسری قوم اس سے منتفع نہ ہو سکے گی اس لئے یہ پروگرام نہ اس قوم کا اپنا ہی رہے گا نہ دوسروں ہی کا ہوگا، نیز خود یہ قوم بھی نہ اِدھر کی رہے گی نہ اُدھر کی۔

دعوتی نقطۂ نظر سے دیگر مذاہب کا جائزہ

مستند مذاہب میں دو ہی اہم مذہب ہیں جن کا آسمانی ہونا خود قرآن نے بتلایا ہے۔ ایک عیسائی مذہب اور دوسرا یہودی مذہب۔

۱۔ عیسائی مذہب کے بارہ میں مثلاً خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "میں اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے آیا ہوں"۔ قرآن حکیم نے بھی ان کی دعوت کو ورسولاً الی بنی اسرائیل فرما کر بنی اسرائیل تک ہی محدود ظاہر کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس دعویٰ کے بعد انجیلی پروگرام غیر اسرائیلی دنیا کے لئے پیغام نہیں ہو سکتا کہ اسے ساری دنیا کا جامع مسلک کہا جائے کہ وہ محض اسرائیلی مزاج کے مطابق فقط قوم اسرائیل ہی کے لئے بھیجا گیا تھا لیکن جبکہ زور و قوت کے بل بوتہ پر اسے عالمگیر بنانے کی سعی لاحاصل کی گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ پھیل کر خود اسی کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور وہ خود اپنوں کی نگاہوں میں ہی ہلکا ہو گیا چنانچہ آج زیادہ تر انھیں اقوام کو عالمگیر مذہب کی تلاش ہے جو دنیا کے ہمہ گیر حالات اور موجودہ دنیا کی عالمیت پسندی کے تحت اپنے قومی مذہب کو عالمگیر دیکھنا چاہتی ہیں لیکن وہ اس کی قومیت میں بین الاقوامیت نہ پا کر مایوس ہو جاتی ہیں اور انھیں عالمگیر مذہب کی جستجو ہوتی ہے جو تمدن کے ہر موڑ پر ان کی رہنمائی کرے اور تسکین کا باعث بن جائے اسی لئے دنیا کی عام متمدن

قوموں کی طرح آئے دن اونچی دنیا کے عیسائیوں ہی کے اعلانات کسی اجتماعی مسلک اور جامع الملل مذہب کی طلب وتلاش میں نکلتے رہتے ہیں خواہ اوس کے معنی حقیقتاً کسی جامع آسمانی مذہب کی تلاش ہی کے ہوں یا کسی نئے مشترک مذہب کی ایجاد کے ہوں جس میں تمام مذاہب کی دل لگتی سچائیاں جمع کرکے اسے بین الاقوامی مذہب بنالیا جائے جیسا کہ اس سعی میں آج کی اور اقوام بھی شریک ہیں جس سے کم ازکم یہ ضرور واضح ہوجاتا ہے کہ ان کی موجودہ پھیکی اور بے روح عیسائیت آج محض قومیت کی شیرازہ بندی کے لئے رہ گئی ہے کسی دینی دستور العمل یا عالمگیر دینی پروگرام کی حیثیت سے قائم نہیں ہے۔ یا آج کی دنیا کا (جس میں مسلمانوں کے سوا تقریباً دنیا کی دوسری سب اقوام شامل اور متفق ہیں) یہ نظریہ کہ سیاست مذہب سے الگ ایک شخصی معاملہ ہے یا جیسے خصوصیت سے عیسائیوں کا یہ مشہور مقولہ کہ "پوپ کا حصہ پوپ کو دو اور بادشاہ کا حصہ بادشاہ کو دو" اس کا شاہد عدل ہے کہ ان مذاہب میں وہ جامعیت نہیں ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر راہنمائی کرسکیں اس لئے وہ اپنے سیاسی اور تمدنی معاملات سے اونھیں الگ رکھنے کی فکر میں ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس صورت حال کے تحت وہ اپنی بڑھتی ہوئی تمدنی زندگی کے لئے سیاست وتمدن کی حد تک یا تو مذہب کو ترک کرکے کوئی دوسرا جامع مذہب تلاش کریں گے یا مشترک مذہب بنانے کی سعی لاحاصل کریں گے ریا پھر اس دائرہ میں لا مذہب رہنے پر قناعت کرلیں گے۔

اس لئے اس قسم کے محدود وطنی یا قومی مذاہب جو مخصوص اقوام کے

وطنی یا قومی مزاج کے مناسب حال کسی وقت اترے ہوں گے جن کے اتارے جانے کا قرآن مجید نے بھی تذکرہ کیا ہے کہ ہر امت میں اور ہر قوم میں ہادی و نذیر بھیجے گئے وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ - وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ - وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ وغیرہ جن میں سے بعض کا تذکرہ نام بنام قرآن و حدیث میں فرمایا گیا ہے اور بہت سے وہ ہیں کہ نام کے ساتھ ان کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔
فَمِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۔ ظاہر ہے کہ ایسے قومی یا وطنی یا نسلی مذاہب دنیا کی تمام اقوام کے لئے کبھی بھی دعوت عام نہیں بن سکتے اور اگر بنائے جائیں گے تو نتیجہ یہی ہوگا کہ اس پھیلاؤ کے بعد خود انھیں کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا اور وہ خود بخود معدوم ہونے لگیں گے۔ گویا ان کی بقا کا راز ہی اس میں مضمر ہے کہ وہ اپنی مخصوص قوم کے حلقوں اور اپنے محدود وطن کی چہار دیواریوں میں نقاب بر سر پڑے رہیں۔

بہت سے وہ مذاہب ہیں کہ اون کی قوموں اور وطنوں کے مٹ جانے پر وہ خود ہی ختم ہو گئے اور جو باقی بھی ہیں کہ اون کی نام لیوا قومیں باقی ہیں تو وہ اپنی اصلیت پر نہیں رہے اور کوئی رہ بھی گیا ہو تو دنیا کے بین الاقوامی دور میں یہ قومیت نشان مذاہب کارآمد نہیں رہ سکتے تھے کہ جب محدود قومیتیں ہی نہ رہیں تو محدود مذاہب بھی نافع نہیں رہ سکے اسی لئے منسوخ کر دیئے گئے۔

۲۔ یہودی مذہب

یہی صورت کچھ یہودی مذہب کی بھی ہے کہ وہ اسرائیلی افتاد مزاج کے مطابق آیا اور اس نے ایک خاص قوم تیار کی جو اپنے دائرہ میں محدود تھی و راب بھی ہے

اسی بنا پر یہود کو اپنے مذہب کی دعوتِ عام دینے کی کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ صرف اسرائیل کی افتادِ طبع کے مناسب حال تھا۔ زیادہ سے زیادہ موسٰے علیہ السلام کو فرعون کی اصلاح کے لئے مامور کیا گیا جیسا کہ قرآن حکیم نے دعوٰی کیا کہ :- اذھب الی فرعون انہ طغیٰ

اور اس کی بڑی غرض و غایت بھی بنی اسرائیل ہی کو اوس کے دامِ ظلم و ستم سے چھڑانا تھا جیسا کہ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے فرمایا کہ :- اَرْسِل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبھم۔

یہودی اقوام پیسہ کمانے کیلئے تو دنیا کے ممالک میں جا سکتی ہیں اور اقوامِ عالم کا خون چوس سکتی ہیں لیکن مذہب کو لے کر نہیں نکل سکتیں کیونکہ وہ خود جانتے ہیں کہ اگر یہ تنگ مذہب جس میں جنت، رحمت، انبیاء سے نسبت حتیٰ کہ خدا تک سے قرابت اور بھائی بندی کے رشتے وغیرہ سب اپنے لئے مخصوص کرکے بقیہ عالم کو محرومِ القسمت بنایا گیا ہے، اگر اپنی قوم سے آگے بڑھایا گیا تو اقوامِ عالم تو اس سے زندہ نہ ہوں گی ہاں وہ خود اقوام کی بھیڑ میں پامال ہو جائے گا اس لئے اسے اپنی ہی رہبانیت گاہوں میں مقفل پڑا رہنا چاہیئے۔

بقیہ مذاہب کی اول تو کوئی سند نہیں کہ اس کی رُو سے اونھیں مستند مان کر اون کے بارہ میں کچھ کہا جا سکے تاہم وہ جس حد تک بھی آبائی تقلید کے نام سے زندہ ہیں اپنی تعلیمات کے لحاظ سے محدود اور تنگ ہیں حتیٰ کہ خود مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے اون کی تنگیوں کو قانونِ ملک سے توسیع مانگ کر وسیع کرنے کی سعی کی جا رہی ہے یا اون کی تنگیوں کی تاویلوں کا سلسلہ جاری

ہے جن سے وہ کسی حد تک اپنی قوم کو سنبھال سکیں جیسا کہ اخبارات میں اس قسم کے واقعات آتے رہتے ہیں۔

ہندو مذہب یا تبت کا لامی مذہب اپنی محدود تعلیمات کے لحاظ سے خود ہی تنگ اور محدود ہیں جیسا کہ اون کی تعلیمات سے ظاہر ہے۔

بہر حال یہ رہبانیت خیز اور گوشہ گیر مذاہب عموماً یا وطنی حد بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں یا قومی بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں حتی کہ ان کے اسماء ہی سے یہ وطنی، قومی اور شخصیتوں کی حد بندیاں اور تنگیاں نمایاں ہیں، ہندو مذہب ملک کی طرف، یہودی مذہب قوم کی طرف اور بدھ مت یا عیسائیت شخصیتوں کی طرف منسوب ہے اس لئے ان کے اسماء ہی ان کی عمومیت اور ہمہ گیری سے انکاری ہیں۔ اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکیمانہ اور بلیغ اندازِ تعبیر سے ظاہر فرمایا ہے کہ:۔

کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃً	نبی اپنی ہی مخصوص قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا
و بعثت الی الناس کافۃً	تھا اور میں دنیا کے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں

پس جبکہ خود ان کے اِسم و رسم اور حقیقت و ماہیت ہی میں پھیل جانے اور تمام اقوام کے اُفق پر چمک کر عام اور عالمی روشنی پھینکنے کی صلاحیت نہ ہو تو اُن کے لئے دعوت و تبلیغ کے سسٹم اور آدابِ تبلیغ کے قواعد و ضوابط یا آداب و شروط کا سوال کب پیدا ہوتا ہے کہ وہ زیرِ بحث آئے۔

اسلامی دعوت کی عالمیت

ہاں جو مذہب اپنی تعلیمات، اپنے اسم و رسم، اپنی نسبت اور اپنی ماہیت و حقیقت کے لحاظ سے ہمہ گیر، جامع ملل اور ساری دنیا کے لئے ایک مکمل پروگرام کی حیثیت رکھتا ہو اور جو اپنی ذاتی وُسعت اور وسعت کے ساتھ کشش عام اور جذب تام کا حامل ہو گویا جس میں خود بخود عالم میں پھیل پڑنے کی اسپرٹ موجود ہو وہی اس کا بھی حقدار ہو سکتا ہے کہ اس کی تبلیغ عام ہو، وہ ہر پلیٹ فارم سے پھیلے اور اس میں فن تبلیغ کے قواعد وضوابط کی تعلیم بحیثیت ایک فن کے دی گئی ہو۔ پس اگر انصاف و شعور سے کام لیا جائے تو سلسلۂ مذاہب میں ایسا مذہب بجز اسلام کے دوسرا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے جس کے نام ہی سے اس کی عمومیت و ہمہ گیری نمایاں ہے۔

اسلام کی عالمیت اُس کے عنوان سے

اولاً اس کے اسم و معنی ہی اُس کی ہمہ گیری کے شاہد بلکہ اس کی ساری اور صفات تک بھی اس کی عالمگیری پر گواہ ہیں چنانچہ جیسے اسلام کا لفظ کسی وطن یا شخص کی طرف منسوب نہیں ایسے ہی اس کے دوسرے صفاتی نام مثلاً سبیل رب، صراط مستقیم، صراط اللہ ہدایت اور حنیفیت وغیرہ بھی پکار پکار کر اعلان کر رہے ہیں کہ وہ نہ کسی ملک اور وطن کی میراث ہے نہ کسی مخصوص قوم کی جاگیر ہے اور نہ کسی نسلی شخصیت کی پرستاری اس کا موضوع ہے بلکہ اس کے ان اسماء ہی سے بجائے وطنیت قومیت اور شخصیت کے اس کا عالمگیر اور ہمہ گیر ہونا صاف ظاہر ہے بلکہ اگر اسلام نے کسی موقعہ پر اپنے آپ کو کسی شخص کی طرف منسوب بھی کیا ہے تو

ساتھ ہی اس شخصیت کو عالمگیر بتلا کر اس کی نسبت سے بھی اپنی عالمگیری ہی ثابت کی ہے مثلاً قرآن نے اسلام کو کہیں کہیں ملتِ ابراہیم کا لقب دیا ہے تو ساتھ ہی ابراہیمؑ کی نسبت یہ بھی ارشاد فرمادیا ہے۔ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (سورۂ بقرہ)۔ (اے ابراہیم! میں تجھے تمام انسانوں کا مقتدا بنانے والا ہوں۔)

پس جبکہ وہ شخصیت مقدسہ جس کی طرف اسلام کی نسبت تھی خود عالمگیر اور تمام اقوامِ عالم کیلئے مقتدا بنادی گئی جیسا کہ ہر زمانہ کی قومیں اس امامت کو تسلیم کرتی آرہی ہیں اور اسلام کے دور میں اس کا ظہور کامل ہوا تو اس نسبت سے بھی اسلام کی وسعت اور ہمہ گیری ہی کی شان نمایاں ہوئی۔

اسلام کی عالمیت ظرف کے لحاظ سے

پھر جیسا کہ اسلام اپنے اسماء و القاب اور اپنی نسبتوں کے لحاظ سے پھیل جانیوالا مذہب معلوم ہوتا ہے اسی طرح اپنی تعلیمات کی رو سے بھی اس نے اپنی عالمگیری نمایاں کی ہے چنانچہ اس نے خصوصیت سے ان تعلیمات کا خاص اہتمام کیا ہے جو اس کے پھیل جانے اور ہمہ گیر بن جانے میں خاص اثر رکھتی ہوں اور اس کی عالمگیر تبلیغ کیلئے متقاضی ثابت ہوں مثلاً پھیل پڑنے کیلئے ضروری تھا کہ وہ وطنی حد بندیوں سے آزاد ہو اور ساری دنیا اس کا وطن ہو تو حضرت داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا (ابن ماجہ) میرے لئے ساری زمین کو مسجد اور ذریعہ پاکی بنایا گیا ہے

دوسری جگہ حلقہ بگوشانِ اسلام کو سارے عالم کی فتوحات کی بشارت اور ترغیب دیتے ہوئے فرمایا جس کا مقصد ساری دنیا کو ان کا وطن باور کرانا ہے:۔

ستفتح علیکم ارضون ویکفیکم اللہ — عنقریب تم پر زمینیں فتح ہونگی اور خدا تمہارے لئے کافی

فلا یعجز احدکم ان یلھو باسھمہ ہے مگر پھر بھی تم میں سے کوئی شخص تیر اندازی (فنونِ جنگ) سے تھکنے نہ پائے (مسند احمد)

ایک جگہ مشرق و مغرب کی فتوحات کی بشارت دیتے ہوئے مُسلم حکام کو عام کہ عدل و احتیاط پر آمادہ فرمایا گیا ارشاد نبویؐ ہے:۔ ستفتح مشارق الارض ومغاربھا علی امتی الا وعمالھا فی النار الامن اتقی اللہ وادّی الامانۃ (ابونعیم فی الحلیہ) (ترجمہ) عنقریب مشرق و مغرب میری امت پر فتح ہوں گے ہاں مگر اس کے حکام جہنمی ہوں گے اِلّا وہ لوگ جو اللہ سے ڈریں گے اور امانت داری سے حقوق ادا کرتے رہیں گے۔"

ایک جگہ ساری زمین کے خزانوں پر اسلام کا قبضہ دکھاتے ہوئے فرمایا گیا:۔ اُوتیتُ بمفاتیح خزائن الارض فوُضِعَتْ فی یدی (بخاری و مسلم)۔ مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں اور خزانے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے۔

اسلام کی عالمیت اُس کی ذاتی صلاحیت کے لحاظ سے

ایک جگہ خود اسلام کے گھر گھر میں داخل ہو جانے کی اطلاع دی گئی ہے ارشاد نبویؐ ہے لا یبقی علی ظھر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز وذُلّ ذلیل۔ (مشکوٰۃ)۔ زمین پر کوئی کچا پکا اور مٹی کا گھرانہ باقی نہ رہیگا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے خواہ عزت سے یعنی اپنی رغبت اور سمجھ سے خواہ ذلت سے (یعنی مجبور اور خوار ہو کر قبول کیا جائے)۔

اسلام کے اس تبلیغی دین ہونے کو اس آیت دعوت میں اُدْعُ سے واضح فرما دیا گیا ہے کیونکہ سبیل رب یا اسلام کی دعوت دینے کا امر جب ہی ممکن تھا کہ خود اسمیں دعوتی اور تبلیغی ہونے کی شان موجود ہو۔ ورنہ اگر وہ تبلیغی نہ ہوتا تو اُدْعُ سے اس کی دعوت دینے کے کوئی معنی ہی نہ تھے پس اسلام کا تبلیغی دین ہونا بھی اسی آیت سے ثابت ہو جاتا ہے۔

اسلام کی عالمیت قومیت کے لحاظ سے

مذکورہ بالا روایاتِ حدیث سے واضح ہے کہ مسلم قوم جس کی ساتھ اسلام وابستہ ہے کسی خاص وطن کی پابند نہیں ساری دنیا اس کا وطن ہے اور کوئی ایک وطن اسے دوسرے وطن سے نہیں روک سکتا۔ بلکہ سارے عالم میں مسلم قوم کے پھیل جانے اور آخر کار اس کے ہمہ گیر اقتدار اور عالمی قبضہ کی خبر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوم جہاں بھی جائے گی اپنا اسلام ساتھ ہی لے کر جائے گی اس لئے دنیا میں اس کے پھیل جانے کی خبر درحقیقت اسلام کے پھیل جانے اور عالمی بن جانے کی اطلاع ہے جو اس کی قوم کے راستہ سے واقعہ بنے گی ادھر خود اسلام کے پوری دنیا میں پھیل جانے اور مذاہبِ عالم پر غالب ہو جانے کی بھی خبر دی گئی ہے جو درحقیقت مسلم قوم کے پھیل جانے کی خبر ہے جیسا کہ ذیل کی قرآنی آیت کریمہ سے واضح ہے

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ	وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول
بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ	کو ہدایت اور سچا دین (یعنی اسلام) دیکر
لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ	(دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا	پر غالب کرے، اور اللہ کافی گواہ ہے۔

پس اسلام کو عالمی بتلا کر مسلم قوم کا عالمی ہونا نمایاں کیا گیا ہے اور مسلم قوم کی عالمیت ظاہر کر کے اسلام کی عالمیت واضح کی گئی ہے

اسلام کی عالمیت وطن کے لحاظ سے

اور یہ ظاہر ہے کہ وطنی عالمیت اور

ہمہ گیری کا سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ سفر اور سیاحت ہے جس سے اسلام کی تعلیم و تبلیغ اور معاشرت و مدنیت ہمہ گیری اختیار کر سکتی تھی اس لئے اسلام نے سفر کی جنس کو ایک عظیم شرعی فریضہ قرار دیا اور نہ صرف کسی ایک ہی نوع کا سفر بتلایا بلکہ متعدد انواع سفر کے تاکیدی اور ترغیبی احکام صادر فرمائے تاکہ مسلمان مار راکد (ٹھہرے ہوئے پانی) کی طرح کسی ایک خطۂ زمین میں جم کر نہ رہ جائیں اور کسی ایک محدود علاقے میں پڑے رہنے کے عادی نہ بن جائیں جس سے اسلام محدودیت کا شکار ہو کر اپنی عالمیت کھو بیٹھے

۱۔ تعلیمی سفر چنانچہ سب سے پہلے تعلیمی سفروں کی ترغیب بلکہ تاکید فرمائی گئی اور اس لئے کی گئی کہ جب اسلام میں علم کسی قبیلہ یا خاندان کی میراث نہ تھا اور صحابہ ہی کے زمانۂ خیر و برکت میں علم تمام خطوں میں منتشر ہو چکا تھا اس لئے تحصیلِ علم بھی کسی ایک مقام کے ساتھ مخصوص نہیں۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں کمالِ علم بغیر سفر کئے ہوئے اور علمی مراکز میں گھومے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتا تھا ارشاد ربانی ہے:۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ	ہر فرقہ (طبقہ) میں سے کچھ کچھ لوگوں نے اس غرض سے کیوں سفر نہیں کیا کہ وہ دین میں تفقہ پیدا کریں اور جب (تحصیل علم سے فارغ ہوکر) واپس آجائیں تو اپنی قوم کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں تاکہ وہ (برے کاموں سے) بچیں۔

۲۔ اخلاقی سفر پھر عبرت پذیری کے لئے اقوام سابقہ کے آثار اور

گرے ہوئے کھنڈروں کی طرف سفر کا حکم فرمایا گیا تاکہ دلوں میں بے ثباتیٔ دنیا کا نقشہ قائم ہو کر اخلاق میں صفائی کا باعث ہو، عمر ناپائیدار کو تہیاً آخرت میں صرف کرنے کے دواعی دلوں میں قائم ہوں، حُبِ دنیا کم ہو اور حُبِ آخرت بڑھے اور رذائل سے نفس پاک و صاف ہو جائے ارشاد حق ہے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ	کیا یہ لوگ دنیا میں سفر نہیں کرتے تاکہ ان
لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ اَوْ اٰذَانٌ	کے لئے سمجھدار اور سننے والے کان حاصل
یَّسْمَعُوْنَ بِھَا	ہوں۔

۳۔ تبلیغی سفر پھر تبلیغ دین کے سلسلہ میں سفروں کا حکم دیا گیا کہ اہل حق طالبوں کے آنے کے منتظر نہ رہیں بلکہ خود ہی تشنۂ ہدایت مواقع پر پہونچکر ہدایت خلق اللہ کا فریضہ انجام دیں موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے مصر کا سفر کرنے اور فرعون کو راہ حق دکھانے کا ارشاد ہوا۔

اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ	جا تو فرعون کی طرف کیونکہ وہ سرکش
اِنَّہٗ طَغٰی	ہو گیا ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حجاز سے عراق پہونچکر نمرود کی اصلاح کا حکم ہوا ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف حجاز میں خود بھی تبلیغی سفر کئے اور جگہ جگہ اقطارِ عالم میں تبلیغی وفود روانہ فرمائے تاکہ عالم کلمۂ حق کے آبِ حیات سے سیراب ہو سکے۔

۴۔ عباداتی سفر پھر عباداتی سفروں کی مستقل بنیاد قائم فرمائی حتی کہ خود ایک سفر ہی کو مستقل عبادت قرار دیا جیسا کہ سفر حج

کہ اس میں چلنا پھرنا، گھومنا دوڑنا، ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچنا اور فوجی انداز سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچکر خیمے گاڑنا اور اکھاڑنا ہی عبادت ہے حتیٰ کہ خاص مکہ کا باشندہ بھی حج کو بلا سفر اختیار کئے ادا نہیں کرسکتا کہ یہ عبادت ہی عین سفر ہے جسے عمر بھر میں ایک دفعہ فرض عین قرار دیا گیا ہے گویا ہر مالدار مسلمان پر مذہبًا ایک دفعہ سفر فرض کر دیا گیا ہے۔

۵۔ جہادی سفر

پھر اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جنگی سفروں کا حکم دیا گیا اور کسی ایک خطہ کا نہیں بلکہ پوری زمین کا جہاں بھی ضرورت محسوس ہو اور اسباب مہیا ہو جائیں۔ اور پھر ان سفروں میں مزید سہولت پیدا کرنے کے لئے نماز بھی آدھی فرما دی گئی۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنَّ الْکَافِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا

اور جب تم سفر میں ہو (خواہ جہادی سفر ہو) تو اس میں کوئی خرابی نہیں کہ تم نمازیں قصر کرو۔ اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ کافر تم کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے۔ کوئی شبہ نہیں کہ کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں

دوسری جگہ اس سفر جہاد کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کے اختیار نہ کرنے پر ملامت فرمائی گئی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی

اے ایمان والو! تم کو کیا ہو گیا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں سفر کرو تو تم بھاری بھرکم بن جاتے ہو

الْاَرْضِ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝

کیا تم دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے ہو (اگر ایسا ہے تو یاد رکھو) آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کچھ نہیں مگر کم

۶۔ تجارتی سفر

پھر تجارتی سفروں کی بنیاد رکھی گئی جو محض روٹی کمانے اور رزق ڈھونڈھنے کے لئے کئے جائیں اور ایسے سفروں کی بھی ترغیب دی گئی ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۝

یہ وہی خدا ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے ذلیل کر دیا اب تم اس کے کاندھوں پر سوار ہو کر چلو پھرو اللہ کا رزق کھاؤ۔

غرض سفروں کی مختلف انواع ہیں جن کو امت کے مختلف طبقات نے اپنے مناسب حال اختیار کیا طلبہ نے تعلیمی سفر کئے، صوفیاء نے اخلاقی سفر کئے، مبلغین اور واعظوں نے تبلیغی سفر کئے، مجاہدین نے جہادی سفر کئے اور تاجروں نے تجارتی سفر کرکے ہر نہج سے ہر ایک طبقہ نے اسلامی خدمات انجام دیں۔ بہر حال زمین کے خطوں میں سفر کرنے، بحر و بر کو ناپنے اور سارے عالم مشارق و مغارب میں گھومنے پھرنے کی ان ہدایات بلکہ تاکیدات سے صاف واضح ہے کہ اسلام اور مسلمان جغرافیائی وطنیت کا قائل نہیں ہے اگر وہ وطن پرور ہے تو بایں معنی کہ ساری دنیا اس کا وطن ہے۔

اسلام کی عالمیت نسل اور رنگ کے لحاظ سے

پھر جیسے اس میں وطنیت اور اصطلاحی قسم کی قومیت نہیں ایسے ہی رنگ و نسل کی حد بندیاں بھی اس کے دامن کو داغدار کئے ہوئے نہیں وہ کسی نسل کسی قبیلہ کسی رنگ کا پابند نہیں بلکہ ساری دنیا کی سارے ہی رنگوں کی اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے قوم واحد بنانے کے لئے آیا ہے ارشاد ربانی ہے:۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا

آپ فرما دیجیئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا

وہ خدا بڑا برکت والا ہے جس نے اپنے بندہ پر قرآن مجید نازل کیا تاکہ وہ تمام عالم والوں کے لئے نذیر بن جائے۔

حدیث نبوی میں ارشاد ہے:۔

كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَىٰ قَوْمِهِ خَاصَّةً. وَ بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً

ہر نبی اپنی ہی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

نیز ارشاد ہوئی ہے

بُعِثْتُ اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ — میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

ان آیات وروایات سے واضح ہے کہ اسلام وطن، نسل، قوم، رنگ وغیرہ کی سب قیدیں اڑاکر چاہتا ہے کہ اس کا پیغام تمام عالم کو پہونچ جائے چنانچہ جگہ جگہ تبلیغ، دعوت، موعظت، تذکیر، نصیحت، امر بالمعروف، ہدایت، ارشاد وغیرہ کے عنوانات سے اس نے اس پروگرام کو پھیلانے اور دنیا کے چپہ چپہ تک پہونچا دینے کی مؤکد ہدایات فرمائی ہیں جس سے واضح ہوگیا کہ اسلام ہی میں بہر نہج پھیلنے عام ہو جانے اور عالمگیر بن جانے کی صلاحیت تھی اس لئے اسی نے اپنا مقصد دعوتِ عام رکھا اور اس لئے اسی مذہب کو جامع اور اجتماعی مذہب کہا جائے گا اور اس لئے وہی تبلیغی کہلائے جانے کا بھی مستحق ہوگا اور اس بناء پر صرف اسی میں طرقِ تبلیغ پر ایک فن کی حیثیت سے بحث بھی ہونی چاہیئے تھی۔

اسلام تبلیغی مذہب ہے

غور کیجئے تو اسی آیت دعوت نے اسلام کے تبلیغی مذہب ہونے اور پھر اس کی تبلیغی عالمیت جامعیت اور احاطۂ کلی کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اس آیت دعوت میں سب سے پہلا کلمہ اُدْعُ کا لایا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سبیل رب کی دعوت دو اور اس کی تبلیغ کرو یعنی اس دین کو پہونچاؤ۔ ظاہر ہے کہ اگر دین یا سبیل رب پہونچانے کی چیز نہ ہوتی تو پہونچانے کا یہ امر کیسے کیا جاتا؟ پس اس امر صریح سے پہلا مسئلہ تو یہ ثابت ہوا کہ اسلام تبلیغی مذہب ہے جو کسی وطن یا علاقہ یا کسی چہار دیواری یا کسی

پہاڑوں خطہ میں چھپائے رکھنے کی چیز نہیں بلکہ اس کا پہونچانا اور پھیلانا فرض قطعی ہے جس کا امر حق تعالیٰ نے اس موقعہ پر تو دعوت کے صیغہ سے فرمایا اور دوسرے موقع پر تبلیغ کے صیغہ سے فرمایا ارشاد ربانی ہے

یَاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ	اے رسول جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ
اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ	پر نازل کیا گیا ہے آپ سب پہونچا دیجئے اور اگر
تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ	آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا

بہر حال دعوت اور تبلیغ کی فرضیت سے اسلام کا تبلیغی مذہب ہونا سورج کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔

اسلامی تبلیغ عالمی ہے

پھر اسی اُدْعُ کے کلمہ سے دوسرا مسئلہ یہ بھی نمایاں ہوتا ہے کہ اسلام صرف تبلیغی مذہب ہی نہیں بلکہ عالمی تبلیغ اور بین الاقوامی دعوت کا مذہب بھی ہے جو کسی ایک وطن یا زمانہ تک محدود نہیں بلکہ تا قیامِ قیامت ہر دور، ہر ملک اور ہر قوم کیلئے اس کی دعوت عام ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُدْعُ کا فعل مطلق لایا گیا ہے جو کسی خاص صورت، خاص حالت یا خاص نسبت سے مقید نہیں اور عربیت کا مسلّمہ ضابطہ ہے کہ فعل کے مطلق لانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احوال وشئون اور سارے ممکن الاجتماع ظروف کے ساتھ جمع ہے اور ساری شانیں اور تقدیریں اس کے عموم و اطلاق کے اندر آئی ہوئی ہیں اور وہ ہر تقدیر کے ساتھ جمع ہو کر پایا جا سکتا ہے۔

پس اس کا خلاصہ واضح الفاظ میں یہ ہے کہ یہ اُدْعُ کی دعوت ہر ممکن شان ہر ممکن حال۔ ہر ممکن زمان اور ہر ممکن مکان میں دی جائے اور اُسے کسی خطۂ زمین یا

وطن یا کسی خاص وقت یا خاص تقدیر کے ساتھ مقید نہ کیا جائے ورنہ فعل کا اطلاق
باطل ہوجائے گا جو اس آیت کا مفاد ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی کا نام بین الاقوامیت
اور عالمیت ہے کہ شئے ہر وطن۔ ہر خطہ اور ہر قوم میں پہونچی ہوئی ہو۔ اس لئے اسلام
کی دعوت و تبلیغ کا عالمی ہونا خواہ بلحاظ وطن ہو یا بلحاظ وقت۔ بلحاظ قومیت ہو
یا بلحاظ رنگ و نسل۔ بلحاظ احوال ہو یا بلحاظ کیفیات و شئون (جیسے تحریری تبلیغ
بصورت تصنیف یا تقریری تبلیغ بصورت خطاب یا اشاراتی تبلیغ بذریعۂ ہیئت
وغیرہ) اسی آیت دعوت کے کلمہ اُدْعُ کے اطلاق سے ثابت ہوگیا۔ اور وہ
یہ ہے کہ آیت میں جب اسلام کو بنام سبیل رب مدعوالیہ (دعوتی پروگرام) ٹھیرا کر
اُس کی طرف اُدع سے دعوت دینے کا امر کیا تو اس کا مفعول ذکر نہیں کیا کہ کن
کو دعوت دو اور یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عربیت کے قواعد کے مطابق ایسے
مواقع میں مفعول کا ذکر نہ کیا جانا اس کے عام ہونے کی دلیل ہوتا ہے تو حاصل یہ
نکلا کہ سبیل رب کی دعوت ہر اس شخص کو دو جس میں فہم خطاب کا مادہ ہو یعنی ہر ایک
عاقل بالغ انسان کو تبلیغ کرو۔ اور ظاہر ہے کہ دعوتِ عام دینا اور ساری دنیا کو
اس دعوت کا مدعو ٹھیرا دینا جب ہی ممکن ہے کہ خود دعوتی پروگرام میں بھی عموم و
ہمہ گیری کی صلاحیت ہو ورنہ امرِ عام عبث ٹھیر جائے جو کلام الٰہی میں محال ہے
اس لئے عموم دعوت اور عمومِ مدعوین کا مقتضا قدرتی طور پر عمومِ مدعوالیہ ہوتا ہے
کہ دعوتی پروگرام بھی بذاتِ خود عالمگیری کی شان رکھتا ہے اس لئے اسلام کا تبلیغی
ہونا، جامع ہونا اور اجتماعی ہونا اسی آیت کے اقتضا سے ثابت ہو جاتا ہے۔
بہرحال یہاں تک مدعوالیہ یعنی دعوتی پروگرام کے احوال و اوصاف کے

متعلق بحث تھی اور الحمد للہ کہ اس کے متعدد بنیادی اور جامع اوصاف تشریعیت یعنی منجانب اللہ ہونا، سنیت یعنی اختراعی نہ ہونا، سذاجت یعنی بے تکلف اور سادہ ہونا، عمومیت یعنی ہمہ گیر ہونا اور اجتماعیت یعنی اس کے کاموں کا جماعتی رنگ میں ہونا سب اس آیتِ دعوت سے ثابت ہو گئے۔

دعوت اور اس کی انواع

دعوتِ قولی

مدعوالیہ یعنی دعوتی پروگرام کی تشریح کے بعد اب نفسِ دعوت کا مقام آتا ہے کہ ایسے جامع پروگرام کو پہونچانے کے لئے دعوت و تبلیغ کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے اور کس انداز سے دعوت دی جائے کہ دنیا کا ہر فرد و بشر اس پروگرام کی طرف مائل ہو جائے۔ آیا محض پروگرام پیش کر دینا کافی ہے یا پیش کرنے کا کوئی خاص ڈھنگ بھی مطلوب ہے؟ تو اس کے متعلق بھی اسی آیتِ دعوت نے کافی روشنی پیش کی ہے دعوت کے طریقوں اور انواع پر روشنی ڈالتے ہوئے آیتِ کریمہ نے بتلایا ہے کہ دعوت الی اللہ اصولاً تین طریقوں میں منحصر ہے جس کی دلیل حصر یہ ہے کہ مذہبی دعوت و تبلیغ جب تک کسی حجت و دلیل پر مبنی نہ ہو ظاہر ہے کہ وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتی اور حجت بیانی کی عقلاً دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ حجت خود اپنے پیش کردہ مذہب کی تحقیق و اثبات کیلئے لائی جائے۔ دوسرے یہ کہ مخالف پر الزام قائم کرنے کیلئے استعمال کی جائے تاکہ وہ لاجواب اور ساکت ہو کر حق کی طرف رُخ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر تحقیق مذہب کے لئے استعمال کی گئی ہے تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں یا یہ حجت ایسی قطعی اور یقینی ہو کہ مخاطب کے دل میں باوّل دہلہ یقین و انشراح کی کیفیات پیدا کر دے اور یا ایسی قطعی نہ ہو بلکہ محض ظنی ہو جس سے مخاطب کو فی الجملہ کسی حد تک مدعا میں طمانیت اور قناعتِ قلبی پیدا ہو جائے

۱۔ حکمت پہلی نوعیت کے ساتھ اثبات مذہب کرنا جو مخاطب کے دل میں مذہب کے اعتقادات کے متعلق یقین اور قطعیت پیدا کر دے حکمت کہلاتا ہے۔

۲۔ موعظت دوسری نوعیت کی حجت سے اثبات مذہب کرنا جس سے مذہبی عقائد کی حقانیت کے متعلق ظن غالب دل میں بیٹھ جائے اور اس کی مخالف جانب مضمحل اور ناقابل شمار ہو کر مغلوب و مستور ہو جائے موعظت کہلاتا ہے۔

۳۔ مجادلت اور تیسری نوعیت کی حجت کے ساتھ مخالف کے سامنے آنا اور اتمام حجت کے ساتھ الزامی جوابات سے اسے ساکت اور لاجواب کر دینا مجادلت کہلاتا ہے۔

انواعِ دعوت کے مخصوص اوصاف

اس تقسیم سے تبلیغِ حق کی انواعِ سہ گانہ مشخص ہوئیں "حکمت" "موعظت" اور "مجادلت" قرآن حکیم نے ان کو پاکیزہ اسلوب پر لانے کیلئے ان کے اوصاف کی طرف بھی واضح اشارے فرمائے ہیں جس سے یہ انواعِ دعوت مخاطبوں کے دلوں میں گھر کر سکیں گویا قرآن نے تنبیہ کی ہے کہ حجت بیانی کے ان تینوں طریقوں میں اسلوب اور روش پاکیزہ ہونی چاہیئے بے ڈھنگا پن نہ ہو بالخصوص مجادلہ و مناظرہ کہ اس میں معاملہ دشمنوں اور معاندوں سے پڑتا ہے جو اثنائے بحث میں اپنی اشتعال انگیزیوں سے اس کی خاص سعی کرتے ہیں کہ مناظرِ اسلام جوش میں آکر آپے سے باہر ہو جائے اور کچھ کا کچھ کہنے لگے تاکہ بجائے مقابل

کے وہ خود ساکت کیا جا سکے اس لئے مناظر کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑیگا
تاکہ دشمن پر اتمام حجت ہو جائے اور مناظر کی کسی حرکت سے مذہب اور مذہبی
استدلال کو صدمہ بھی نہ پہونچنے پائے اس لئے مجادلہ پاکیزہ ڈھنگ پر لانے اور
اس میں حسن وخوبی پیدا کرنے کیلئے قرآن نے تین لفظ استعمال فرمائے ہیں بالّتی
اور ھِیَ اور احسن یعنی مجادلہ اس روش پر ہو کہ وہ روش بہتر سے بہتر ہو اور یہ عربیت
کا مانا ہوا قاعدہ ہے کہ کثرۃ المبانی تدل علی کثرۃ المعانی (الفاظ کی کثرت
معانی اور مقاصد کی کثرت کی دلیل ہوتی ہے)

ظاہر ہے کہ جب یہاں معنی ومقصد حسنِ مجادلہ ہے تو یہ الفاظ کی کثرت اس
حسن ہی کی زیادت وکثرت اور تاکید در تاکید کے لئے ہوسکتی ہے۔ اب حاصل یہ
نکلا کہ اپنے مجادلہ میں حسن در حسن پیدا کرو کیونکہ سابقہ دشمن معاند سے ہے جسے نام کرنا ہی
تو کوئی ادنیٰ بے ڈھنگا پن بھی نہ ہونے پائے کہ اس دین یا مُناظر دین کی ہوا خیزی
کا موقع ملے۔

ادھر موعظت میں سابقہ اپنوں سے ہوتا ہے دشمنوں سے نہیں اس لئے
اس میں کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہ تھی البتہ یہ ضرور تھا کہ موعظت کی تاثیر
پیرایۂ بیان کی عمدگی سے ہوسکتی تھی کہ عنوان دلچسپ ہو تاکہ مخاطبوں پر اثر
پڑ سکے گویا موعظت میں حسن پیدا کرنے کیلئے نہ تو اتنی تاکید کی ضرورت تھی کہ کئی
کئی الفاظ سے اُسے مضبوط کیا جاتا اور نہ اُسے حسن وخوبی سے معرّی چھوڑ دیا جانا
ہی مفید تھا کہ کوئی لفظ بھی حسنِ موعظت پر دلالت کرنے والا نہ لایا جاتا بلکہ اس
حقیقت کے پیشِ نظر کہ جب موعظت کا پیرایۂ بیان اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی

اور ممکن تھا کہ اس آیت کا مخاطب ہر اچھی بُری اور ڈھنگی یا بے ڈھنگی موعظت میں اپنے کو آزاد سمجھتا اس لیئے موعظت کے ساتھ صرف حَسَنَۃ کی ایک قید لائی جانی کافی سمجھی گئی تاکہ واعظ اور مذکر مضمون وعظ کو ذہن میں مرتب کر کے خوبصورت اور موثر پیرایہ میں ادا کر دے۔

ادھر حکمت میں سابقہ عقلاء اور تحقیق پسند اصحاب سے پڑتا ہے جن سے اشتعال انگیزی یا تمسخر و استہزار کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا وہ اپنی حکمت پسندی سے ہمہ تن صرف حکمت ہی سننے کے متلاشی ہوتے ہیں نہ کہ متکلم کی ذات یا مسلک پر حملہ کر کے اسے مشتعل کرنے کا جذبہ لیئے ہوئے ہوتے ہیں اس لیئے اُن سے تخاطب کے وقت ضرورت صرف ایسے ہی کلام کی ہو سکتی تھی جو بذاتہ اعلیٰ اور پاکیزہ ہو کہ اُسے جس پیرایہ میں بھی پیش کر دو دلپذیر ہی ہو اور یہ شان حکمت و حقائق ہی کی ہوتی ہے کہ وہ پیرایوں کی خوبصورتی اور عنوانوں کی شوخی کی محتاج نہیں ہوتیں بلکہ اُن میں خود بذاتہ ایک کشش اور دلپذیری ہوتی ہے جو اُنھیں عنوانوں سے مستغنی رکھتی ہے حتیٰ کہ حقائق بیانی میں عنوانات کو آراستہ کرنے کی فکر کی جائے تو بسا اوقات کلام بھدا اور غیر موثر ہو جاتا ہے اس لئے یہاں حکمت کے ساتھ حسن کی کوئی بھی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی کہ حکمت کبھی بھدی اور غیر حسن ہوتی ہی نہیں کہ اسے حسنہ اور غیر حسنہ کی طرف منقسم کیا جائے نیز اس کے مخاطب ایسے نامعقول ہوتے ہی نہیں کہ اُن کے خیال سے کلام حکمت کی لفظی آرائش و زیبائش کی فکر کی جائے۔

خلاصہ یہ کہ مناظرہ جبکہ بہت اچھا بھی ہو سکتا تھا اگر ڈھنگ سے ہو۔ اور

بہت برا بھی ہو سکتا تھا اگر جذبات درمیان میں آجائیں اس لئے اس کی بہت بُرائی
کے دفعیہ اور بہت خوبی کی تحصیل کے لئے تین تاکیدی کلمات آئے مبالغتی ۔ ھی
احسن ادھر موعظت جبکہ کبھی اچھے ڈھنگ پر ہوتی تھی کبھی بُرے رنگ پر
اس لئے اس کی مطلق بُرائی رفع کرنے اور اسی درجہ کی خوبی پیدا کرنے کے لئے
اس کی صرف ایک صفت حَسَنَۃ پر قناعت کی گئی ادھر حکمت جبکہ سرتاپا
خوبی تھی اُسے صفات کے ذریعہ اچھا بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی اس لئے یہاں حکمت
کے ساتھ کسی صفت کے لانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ۔

دعوت عملی کی صورتیں

پھر قرآن میں دعوت الی اللہ کے ان تین طریقوں حکمت، موعظت، مجادلت کے ساتھ چونکہ کوئی قید اور تخصیص مذکور نہیں اس لئے یہ تینوں طریقے اپنے عموم اور اطلاق پر باقی رہیں گے اور دعوت و تبلیغ کا عموم یہی ہو سکتا ہے کہ خواہ وہ قولی ہو یا فعلی یعنی مبلغ خواہ زبان سے حق کی دعوت دے یا اپنے کسی طرز عمل سے دونوں کا ڈھنگ ایسا ہونا چاہیئے کہ مخاطبوں کے دل میں حق سرایت کر جائے اور وہ حق کی طرف جھک پڑیں۔ گویا جس طرح مبلغ کے حسن بیان سے مخاطب کے شبہات رفع ہوتے تھے اور حق و صداقت پر قناعت قلبی اور طمانیت پیدا ہوتی تھی اسی طرح اس کا طرز عمل بلکہ ہر نقل و حرکت بھی تبلیغی ہی ہونی چاہیئے جس سے لوگ جوق در جوق دائرۂ حق میں داخل ہو جائیں، عملی حکمت سے ان کے دلوں میں دین پر وثوق و ایقان پیدا ہو، عملی موعظت سے ان میں قناعتِ قلبی قائم ہو اور عملی مجادلت سے ان کے شکوک و شبہات کا قلع قمع ہو جائے،

اس لحاظ سے دعوت کی یہ سہ گانہ قسمیں نظری اور عملی کی طرف منقسم ہو کر چھ ہو جائیں گی۔ حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی، موعظتِ نظری اور موعظتِ عملی مجادلۂ نظری اور مجادلۂ عملی۔

دعوتِ قولی کی تینوں قسموں کی تفصیلات ابھی ابھی گذر چکی ہیں جن میں حکمت و موعظت اور مجادلت کا علمی اور فکری پہلو واضح کیا گیا تھا جو مخاطب

کو حقیقت کے سامنے بر در علم جھکا دیتا تھا لیکن یہی تینوں حقیقتیں جب عملی رنگ میں سالک کی ذات سے صادر ہوتی ہیں تو یہ عملی تبلیغ عامۂ ناس کے حق میں نظری سے بھی زیادہ قوی اور موثر ثابت ہوتی ہے اور مخاطبوں کو مبلغ کے سامنے اور بھی زیادہ سرنگوں کر دیتی ہے۔

مثلاً حکمت عملی کے تحت انبیاء علیہم السلام کے معجزات، اولیاء کرام کی کرامات مصلحین کے اصلاحی رنگ ڈھنگ ایسے اونچے دلائل ہیں کہ تاثیر عام میں ان کا مقابلہ فکری دلائل نہیں کر سکتے، علمی میدان میں ایک چیز محض کہی جاتی ہے اور عملی میدان میں اُسے کر کے دکھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ کا جو اثر ہو سکتا ہے وہ محض کہنے سننے کا نہیں ہو سکتا۔

موعظت عملی

موعظتِ عملی کے سلسلہ میں ایک داعیٔ دین نے اپنے ایک متوسل کے دل سے حسن صورت کی محبت مٹانے اور حسن سیرت کی محبت قائم کرنے کے لئے زبان کے بجائے عملی حکمت سے اس طرح کام لیا کہ اپنی ایک چھوکری کو جو، ان کے ایک متوسل کی منظورِ نظر ہو گئی تھی اور ذکر اللہ میں حارج ہوتی تھی مُسہلہ دوائیں کھلا کر زرد رنگ بدہیئت اور بے انتہا لاغر بنا دیا پھر اس متوسل کے پاس امتحاناً بھیجا متوسل نے معمول سابق کے خلاف بجائے میلان کے اعراض اور تنفر اختیار کیا اور نگاہ بھر کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا شیخ نے یہ کیفیت دیکھ کر متوسل کو ان فضلات و نجاسات پر لا کر کھڑا کر دیا اور فرمایا کہ یہ ہے آپ کا محبوب چھوکری آپ کی محبوبہ نہ تھی کیونکہ جب تک اس چھوکری میں یہ نجس فضلات بھرے ہوئے تھے آپ کو اس سے محبت تھی

آج یہ فضلات اس کے بدن سے خارج ہو گئے تو آپ کو نفرت ہو گئی اس لئے آپ کا محبوب یہ لڑکی نہیں ہے کہ اس کی ذات تو اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی بلکہ یہ بول و براز ہے۔

اس سے طالب کو عبرت اور ہدایت ہوئی اور اس کا دل صورتوں کی محبت سے پاک ہو کر سیرتوں کا طالب بن گیا۔ پس یہ موعظت تھی مگر عملی اور موعظت علمی سے کہیں زیادہ مؤثر جس نے ایک دم اس مرید کے دل کی کایا پلٹ دی۔

مجادلۂ عملی | یا مثلاً مجادلۂ عملی کے سلسلہ میں حضرت شبلیؒ کے زمانہ میں دہریوں نے قرآن کی اس آیت کو رد کرتے ہوئے کہ روح امرِ الٰہی کا نام ہے یہ دعویٰ کیا کہ روح خون کی حرارت اور بخارِ لطیف کا نام ہے جس سے آدمی زندہ ہے، زندگی اور روح کو امرِ الٰہی سے کیا تعلق؟ شیخ نے بجائے علمی مناظروں کے اسی وقت برسرِ مجمع اپنی شہ رگیں کٹوا کر سارا خون نکلوا دیا اور پھر کھڑے ہو کر فرمایا کہ اب میں کیوں زندہ ہوں جبکہ مجھ میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں ہے؟ کیا اب بھی اس میں کوئی شبہ ہے کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی زندگی محض امرِ الٰہی سے قائم ہوتی ہے خون سے نہیں۔ یہ مجادلہ تھا مگر عملی اور علمی مجادلہ سے کہیں زیادہ مؤثر، کیونکہ اب تک کے فلسفیانہ مناظروں سے ادھر تو لوگوں کے شبہات میں اضافہ ہو رہا تھا اور ادھر دہریوں کی آواز کو پھیلنے کا موقع مل رہا تھا لیکن شیخ کے اس عملی مجادلہ سے دہریوں کی شہ رگ کٹ گئی اور شبہات زدہ لوگ سب کے سب ہدایت پر آ گئے۔

حکمتِ عملی | یا مثلاً حکمت عملی کے سلسلے میں بعض مشائخؒ کے سامنے چند

فلسفی مزاج لوگوں نے کلام الٰہی کی جھاڑ پھونک اور دعا کے مؤثر ہونے کا انکار کیا، شیخ نے بجائے قولی تفہیم کے انھیں تیز کلامی کے ساتھ چند تہذیب سے گرے ہوئے جملے کہہ ڈالے جس سے یہ فلسفی غیظ و غضب اور انتہائی جوش میں آگئے ان کا بدن کپکپانے لگا اور خون کھول جانے سے چہرے تمتما اٹھے، کچھ وقفہ کے بعد شیخ نے ان کی تعریف میں کچھ غیر معمولی اور مبالغہ آمیز کلمات کہہ دیئے جن سے وہ پہلا اثر زائل ہوکر ایک نیا اثر انبساط و نشاط کا پیدا ہوگیا، اس پر شیخ نے فرمایا تم سمجھے کہ میں نے کیا کیا؟ یہ میں نے تمہیں عملی جواب دیا ہے، تم غور کرو کہ میرے چند کلمات نے جو در حقیقت واقعیت بھی لئے ہوئے نہ تھے تم میں اس قدر ہیجان عظیم اور انقلاب بپا کر دیا کہ تمہارے چہرے سفید سے سرخ اور سرخ سے سفید ہوگئے تمہارے بدن ساکن سے متحرک اور متحرک سے ساکن ہوگئے، اندرونی قویٰ میں انبساط سے انقباض اور انقباض سے انبساط پیدا ہوگیا اور تمہارے نفسانی نظام میں ہیجان بپا ہوگیا تو کیا خدا کا پاک کلام جو حقیقتاً روحِ حیات ہے بدن اور روح میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کرسکتا کہ آدمی صحت سے مرض اور مرض سے صحت کی طرف لوٹ جائے اور اس کی طبیعت اس درجہ نشاط و قوت کا اثر قبول کرے، کہ خود ہی مرض کو دفع کرنے میں کامیاب ہو جائے؟ پس یہ حکمت تھی مگر عملی جو حکمتِ نظری سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔

بہر حال حجتِ بیانی کے یہ تینوں طریقے قولی یا نظری کی قید سے مقید نہ تھے بلکہ بلا قید ذکر کئے جانے کے سبب نظری اور عملی دونوں کو عام تھے اس لئے جہاں دعوتِ قولی کی یہ تین قسمیں آیتِ دعوت سے ثابت ہوئیں وہیں دعوتِ عملی

کی بھی یہی تینوں قسمیں اسی آیت سے ثابت ہوئیں اور اگر دعوت نظری مع اپنی تینوں قسموں کے مبلغ کے لئے ضروری ہے تو دعوت عملی بھی مبلغ کے لئے اسی آیت سے ضروری ثابت ہوئی۔

دعوت میں مخاطب کے مزاج و ذہنیت کی رعایت

ہاں پھر دعوت الی اللہ کے یہ چھ طریقے اور اصول جبکہ اس لئے وضع کئے گئے کہ مخاطبوں کی قسمیں بھی دنیا میں اتنی ہی تھیں تو اس سے ایک اصول خود نکل آیا اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ کو محض تبلیغ ہی مطلوب نہیں بلکہ اس کے ساتھ مخاطبوں کے احوال اور طبائع کی رعایت بھی منظور ہے جس کا منشا شفقت ہے، اگر بنی آدم کے مزاجوں اور ذہنیتوں کی رعایت ملحوظِ خاطر نہ ہوتی تو صرف احکامِ الٰہی کا پہونچا دیا جانا کافی سمجھا جاتا، استدلال کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی چہ جائیکہ استدلال کی انواع و اقسام پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی پس جبکہ انسانوں کے داعیٔ اوّل حق جل مجدہٗ نے اپنے مخاطبوں کی یہ رعایت فرمائی تو اس سے آیت کا منشار صاف طور پر واضح ہوا کہ تمام داعیانِ دین کا فرض ہے کہ وہ رعایتِ طبع کے ماتحت مخاطبوں کی ذہنیتوں کا اندازہ کر کے تبلیغ کا آغاز کریں ورنہ بلا رعایتِ طبائع ان کی دعوت و تبلیغ مؤثر نہیں ہوگی اس ثابت شدہ کلیہ کے ماتحت رعایتِ طبائع کی جس قدر بھی جزئیات ہوں گی وہ سب اسی آیت سے ثابت شدہ مانی جائیں گی۔

تبلیغی کلام کی فصاحت و بلاغت

چنانچہ اس کلیہ کا ایک فرد یہ ہے کہ مبلغ اپنے کلام کو فصاحت و بلاغت سے آراستہ کرے خواہ وہ حکمت سے کام لے یا موعظت اور مجادلہ کے میدان میں آئے بہر حال بے تکلفانہ انداز سے شستہ کلامی، فصاحت لسانی اور بلاغت بیانی اس کا خاص شعار ہونا چاہیئے تاکہ مخاطب صحیح عنوان سے صحیح مقاصد ہی اخذ کر سکے۔ اگر کلام میں پیچیدگی، گنجلک اور بے ترتیبی ہو یا کلام ان محاورات کے مطابق نہ ہو جس کے اہل لسان خوگر ہوں تو مخاطب صحیح اثر قبول نہ کر سکیں گے اور کلام رائیگاں چلا جائے گا۔ اس لئے کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ مقتضائے حال کے مطابق ہو، زمانہ اور وقت کی زبان میں ہو اور ایسے عنوان سے ہو جو لوگوں میں معروف اور متعارف ہو۔ غریب لغات نا شناسا تعبیرات اور بے محاورہ کلام نہ ہو ورنہ کلام میں نہ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے نہ تاثیر۔ اس لئے حدیث نبوی میں اس قسم کے کلام کی صریح ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

نَهَىٰ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْأُغْلُوطَاتِ (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے پیچیدہ اور مغالطہ انگیز کلام سے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغی سلسلہ میں اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھنے کی یہ کہکر درخواست کی کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں اور میری تقریر کی تائید میں جب وہ رواں اور صاف تقریر کرینگے

تو قلوب پر اچھا اثر پڑے گا ورنہ مجھے ڈر ہے کہ میری رکتی ہوئی زبان سے لوگ بُرا اثر نہ لیں اور تکذیب کے درپے نہ ہو جائیں۔ ارشاد ہے۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ	اور (اے میرے رب) میرے بھائی ہارون
مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ	کی زبان مجھ سے زیادہ رواں ہے تو ان
مَعِیَ رِدْءًا یُّصَدِّقُنِیْ	کو میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیج دیجئے
اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ	کہ وہ (میری تقریر کی تائید اور) تصدیق کریں گے
یُّکَذِّبُوْنِ ہ	ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ (فرعون
(القصص)	اور اس کے درباری) میری تکذیب نہ کریں

اس واقعہ سے واضح ہے کہ کلام مخاطبوں کی ذہنیت کے مناسب ہو کر ہی اثر انداز ہوتا ہے گویا شہروں میں ادبی زبان، دیہات میں معمولی اور سادہ زبان، علمی طبقوں میں اصطلاحی زبان اور اہلِ فنون کے طبقہ میں فلسفیانہ زبان ہی مفید اور مؤثر ہو سکتی ہے۔

تنوعِ مضامینِ دعوت

پھر مخاطبوں کی رعایت کے سلسلہ میں مبلغ پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ کو مختلف قسم کے مضامین سے آراستہ کر کے پیش کرے اس میں وعدے بھی ہوں اور وعیدیں بھی، بشارتیں بھی ہوں اور تخویفیں بھی، ترغیب بھی ہو اور ترہیب بھی، صفتِ جنت بھی ہو اور احوالِ نار بھی، فضائل بھی ہوں اور احکام بھی، مسائل بھی ہوں اور دلائل بھی، قصص بھی ہوں اور عبر و امثال بھی، حِکَم و اَسرار بھی ہوں اور سنجیدہ لطائف و ظرائف بھی۔ غرض جو قرآن کریم کا

طرزِ خطاب ہے اسی کے نقشِ قدم پر دعوت بھی مختلف الالوان مضامین پر مشتمل ہونی چاہیئے تاکہ نو بہ نو مضامین سے مخاطبوں کے شوق کی تجدید ہوتی رہے ورنہ ایک ہی نوع کے مضامین سے مخاطب تنگ ہو کر اکتا جائیں گے اور تبلیغ کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

مثلاً نوعیتِ بیان یہ ہونی چاہیئے کہ اولاً اس میں نیکی کے فضائل اور بدی کی مذمت بیان ہو، خواہ وہ نیکی بدی عبادت کے دائرہ کی ہو یا عادت اور معاشرت کی ہو، معاملات کی ہو یا معیشتِ خانگی کی، تدبیرِ منزل کی ہو یا سیاستِ مُدن کی۔ جب مخاطبین ادھر جھک جائیں تو پھر ذکر اللہ اور طاعتِ حق کی مثالیں پیش کی جائیں۔ جب اس درجہ پر آکر اُن کا شوق بھڑک اُٹھے تو پھر انہیں ضبطِ لسان اور حفاظتِ قلب کی تلقین کی جائے کہ اُسے بُرے خیالات اور گندے اخلاق کا ظرف نہ بنائیں۔ زبان کو سَبّ وشتم، غیبت، چغلی اور فضول گوئی سے آلودہ نہ کریں۔ پھر اس مقصد پر مخاطبوں کو ابھارنے کیلئے سلف کی پاکبازانہ زندگیوں کے واقعات ذکر کیئے جائیں، تاریخی حوالے پیش کیئے جائیں مہذب قوموں اور متدین قرون کے احوال سنائے جائیں، اُن کے نیک انجام پر روشنی ڈالی جائے، نیز عبرت کے لئے بدکار اقوام کا انجامِ بد دکھلایا جائے پھر لمبی چوڑی اُمیدوں اور غفلتوں کو توڑنے کے لئے بے ثباتیِ دنیا اور زندگی کی ناپائیداری کا ذکر کیا جائے کہ یہ سارا عالم قصہ کہانی سے زیادہ نہیں ہے

حالِ دنیا را بپرسیدم من از فرزانۂ — گفت یا خوابست یا بادست یا افسانۂ

باز پرسیدم بحالِ آنکہ درو دل بہ بست — گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانۂ

پھر قلوب میں رقت اور رجوع وانابت نیز سامعین میں خوف خدا پیدا کرنے کے لئے موت اور اہوال موت کا ذکر کیا جائے کہ فنا کی ساعت قریب ہے مہلت کم ہے ہر عمل کا انجام سامنے آنے والا ہے پھر نزع اور قبض روح کے وہ جنبی حالات جو سب کی نگاہوں سے گذرتے ہیں سنائے جائیں کہ کس طرح دنیا سے کوچ ہوتا ہے اور کس طرح ایک انسان اپنے سارے مرغوبات نفس دم کے دم میں چھوڑ کر اس طرح چل دیتا ہے کہ پھر اس کا کوئی نقش پا بھی دنیا میں باقی نہیں رہتا ؎

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

پھر قبر کی ہولناکی اس کی وحشت و تنہائی اور بے مونسی کا منظر پیش کیا جائے اور یہ کہ اس کی ہر مصیبت کا تدارک عمل صالح ہے پھر یوم حساب اور اس کی شدت اور غضب الٰہی کا ظہور، تمام حشر کے ہولناک حوادث ملائکہ اور انبیاء علیہم السّلام کا لرزہ براندام ہونا اور ہر ایک نفس کا اپنی فکر میں غرق ہونا وغیرہ سامنے لایا جائے پھر جنت و نار، نعیم و جحیم اور رحمت و قہر کے نمونے دکھلائے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس نوعیت کے مضامین سے تبلیغ لبریز ہوگی تو بلاشبہ قلوب میں اثر پیدا کرے گی کیونکہ اس میں طبائع، قلوب اور ارواح سب ہی کی رعایت ہوگی جو روح تربیت ہے اور جبکہ مخاطبین کے احوال کی رعایت آیت دعوت سے ضروری ثابت ہوئی تو اس قسم کے تمام امور جن کو مخاطبوں کی رعایت طبائع میں دخل ہے بلاشبہ آیت کا مقتضیٰ ہو کر اسی سے ثابت شدہ مانے جائیں گے۔

تجدّدِ دعوت | مخاطبوں کی اسی رعایت احوال کا یہ بھی تقاضا ہے کہ

دعوت و تبلیغ ہر وقت اور ہر روز بلاغہ نہ کی جائے ورنہ مخاطب اکتا جائیں گے
اور آثارِ تبلیغ باطل ہو جائیں گے بلکہ درمیان میں وقفے اور ناغے دیکر تبلیغ کو جاری
کیا جائے تاکہ ان کا شوق ہر وقت تازہ بتازہ باقی رہے چنانچہ حضرت شقیق
بلخیؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہفتہ میں ہر جمعرات کو وعظ و تذکیر
فرمایا کرتے تھے ایک شخص نے عرض کیا کہ اے ابو عبدالرحمٰن کاش آپ ہمیں ہر روز
وعظ سنایا کرتے تو حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا

اَمَا اَنَّهٗ یَمْنَعُنِیْ مِنْ ذٰلِكَ اِنِّیْ اُكْرِهُ اَنْ اُمِلَّكُمْ وَاِنِّیْ اَتَخَوَّلُ عَلَیْكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَیْنَا۔ (بخاری و مسلم)

خبردار! مجھ کو ہر روز وعظ کہنے میں مانع یہ ہے کہ میں تم کو اُکتا دینا نہیں چاہتا۔ میں اسی طرح وعظ میں وقفے کرتا ہوں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اُکتانے کے ڈر سے وقفے فرمایا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جب ماننے والے عقیدتمندوں میں بھی روز روز کی تذکیر و موعظت سے
اکتا جانے کا خطرہ تھا جس کی وجہ سے وعظ کو ہفتہ وار رکھا گیا تو غیر معتقد غیر مسلموں
میں تو یہ خطرہ اور بھی زیادہ ہونا چاہیئے اس لئے تبلیغ بھی وقفہ بوقفہ اور ساعت بہ
ساعت ہونی چاہیئے تاکہ رفتہ رفتہ استعداد اُبھرتی رہے اور شوق قائم رہے۔
غور کرو تو یہ مقصد بھی اسی آیت دعوت سے ثابت ہو رہا ہے کیونکہ اس دعوت
و تذکیر کا امر اُدْعُ کے صیغہ سے فرمایا گیا ہے جو فعل ہے اور عربیت کے قاعدہ
سے فعل تجدّد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے جو گہ وبیگہ ہو نہ کہ دوام و استمرار پر
جو مسلسل اور ہمہ وقت ہو اس لئے اس آیت سے تجدّدِ دعوت بھی ثابت ہو گیا۔

ترک غلظت وشدت

پھر اسی رعایت طبائع کے ماتحت یہ بھی ضروری ہے کہ داعی الی اللہ کا کلام نفرت انگیز مضامین سے پاک ہو اس میں افراد یا جماعتوں پر حملہ نہ ہو، توہین آمیز پیرائے نہ ہوں، کسی فرد یا جماعت کا نام لیکر بُرا بھلا نہ کہا جائے، کلام میں تعریض وتلمیح نہ ہو طعن وتشنیع کا رنگ نہ ہو ورنہ ان قبائح پر مشتمل تبلیغ تعصب، جانبداری اور بدخلقی پر محمول کی جائے گی جس کا اثر کبھی اچھا نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے حضورؐ نے حضرت ابوموسی اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو یمن روانہ فرماتے وقت جہاں عیسائی رعایا کی اکثریت تھی بطور نصیحت فرمایا تھا۔

بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَيَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا	وہاں کے لوگوں کو خوشخبریاں سنانا، نفرتیں مت دلانا، آسانیاں بہم پہونچانا سختی مت کرنا، باہمی اطاعت (وتعاون) سے رہنا اختلافات مت پھیلانا

تاخیر دعوت

پھر اسی رعایتِ طبائع کے اصول کے ماتحت مبلّغ کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ اپنے مخاطبوں کے احوال پر نظر ڈال کر ان کی آمادگی اور صلاحیتِ قبول کی بھی جانچ کرے اور تا بحدّ قبول ہی انھیں تبلیغ احکام کرے حتی کہ اگر ان کی حالت کسی وقت ترکِ تبلیغ کی مقتضی ہو تو اس وقت ترکِ تبلیغ وموعظت ہی کو مصلحتِ شرعی سمجھے بلکہ ایسی حالت میں یہ ترکِ تبلیغ بھی حکم میں تبلیغ کے ہوگی ورنہ یا آثارِ قبول ظاہر نہ ہوسکیں گے اور یا مبلغ کی طرف سے سُوءِ عقیدت پیدا ہو جائے گی جو آئندہ کی توقعاتِ

قبولیت کا راستہ بھی بند کر دے گی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک از روئے وحی کعبہ کی تعمیر میں حطیم کا حصہ بھی شامل ہونا چاہیے تھا کہ وہ جزء کعبہ تھا اور آپ دل سے چاہتے تھے کہ کعبہ کی موجودہ عمارت ڈھا کر اس کی از سر نو تعمیر ہو جس میں حطیم بھی داخل عمارت ہو جائے لیکن محض اس مصلحت سے کہ قوم نو مسلم اور جاہلیت سے قریب العہد ہے کہیں اس تخریب و تعمیر جدید سے حضور پر یہ الزام نہ لگائیں کہ یہ کیسے پیغمبر ہیں جنھوں نے پہلے کعبہ ہی پر ہاتھ صاف کیا اور اس سے سوء عقیدت پیدا ہو جائے جو آئندہ ہر ایک تبلیغ اور تسلیم و قبول سے قوم کی محرومی کا باعث ہو آپ نے یہ نئی تعمیر ملتوی فرما دی جس سے واضح ہے کہ مقاصد شرعیہ کے اجراء و تنفیذ میں مخاطبوں کے احوال کی رعایت ناگزیر ہے اور یہ اندازہ لگا لینا ضروری ہے کہ اس مقصد شرعی (مثلاً تبلیغ) کے قبول کرنے پر ان کی طبائع کس حد تک آمادہ ہیں اور فی الحال ان کے سامنے کتنی بات رکھنی چاہیے۔

اغماض و مسامحت

حتیٰ کہ بعض اوقات مخاطب کو ایک صریح معصیت میں مبتلا دیکھتے ہوئے بھی محض اس مصلحت سے نصیحت ترک کر دی جاتی ہے اور معصیت کو ہونے دیا جاتا ہے کہ مخاطب کی حالت قبول نصیحت کے مقام پر پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ اور اندیشہ ہوتا ہے کہ نصیحت سے چڑ کر کہیں معصیت پر اور زیادہ مُصر نہ ہو جائے کہ پھر نصیحت کا مقام ہی نہ آنے پائے۔

صحن نبوی میں ایک اعرابی نے پیشاب کرنا شروع کر دیا جو یقیناً معصیت تھی

صحابہؓ نے اُسے ڈانٹنا دھمکانا چاہا گویا نہی عن المنکر پر آمادہ ہوئے۔ آپؐ نے سب کو روک دیا اور اعرابی کی اس ناجائز حرکت کو ہونے دیا کہ اس حالت میں روکنے اور دھمکانے سے اس کا پیشاب بند ہوجاتا اور وہ بیمار پڑجاتا۔ حاجت سے فراغت کے بعد صحن مسجد کو تو حضورؐ نے پاک کرادیا اور اُسے بلاکر بہت پیار محبت اور نرمی سے فرمایا اے عزیز! مساجد اس قسم کے کاموں کے لئے نہیں بنائی گئیں ان کا موضوع نماز اور ذکر اللہ ہے۔

اعرابی پر اس طرزِ نصیحت کا غیر معمولی اثر ہوا اور بولا کہ آنحضرتؐ نے نہ مجھ کو مارا اور نہ بُرا بھلا کہا۔ میں نے تو ایسا شفیق اور پاکباز معلّم کبھی دیکھا ہی نہیں۔

اغماض از معصیت کے سلسلہ میں یہ مثال مادّی ضرر کی تھی۔ یہی صورت معنوی اور روحانی ضرر کی بھی ہے۔ بعض لوگوں نے دین قبول کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرط کی کہ ہم نماز صرف دو وقت کی ادا کریں گے، آپؐ نے یہ شرط قبول فرمالی نہ اس لئے کہ تین وقت کی نماز فرض نہ تھی یا اس کا چھوڑ دینا معصیت نہ تھا بلکہ اس لئے کہ اگر اس وقت اس شرط کو نہ مانا جاتا تو وہ سرے سے اسلام ہی قبول نہ کرتے اور ظاہر ہے کہ اسلام سے محروم ہوکر کافر رہنا زیادہ مضر تھا بہ نسبت مسلم بن کر تین وقت کی نماز نہ پڑھنے کے۔ ساتھ ہی یہ معاملہ اس لئے بھی حضرتؐ نے ان کے لیے مضر نہ سمجھا کہ حضورؐ کو یقین تھا کہ اس وقت کی یہ شرط انھوں نے محض تکاسل اور تساہل سے لگائی ہے جب یہ دو وقت کی نماز کے عادی ہوجائیں گے تو یہی دو نمازیں بقیہ تین نمازیں بھی ان سے پڑھوادیں گی اور وہ خود ہی ادا کرنے لگیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ آخر کار وہ پانچوں نمازوں کے عادی ہوگئے۔

بہر حال یہ ساری صورتیں رعایتِ طبائع کے افراد ہیں اور رعایتِ طبائع اس آیت دعوت کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہونے کی وجہ سے بطور اقتضاء النص اس آیت سے ثابت شدہ ہے اس لئے اس کے سارے افراد ہی طبعًا اس آیت سے ثابت شدہ مانے جائیں گے۔

مخاطبوں کے ساتھ شفقت و رحمت

نظر کو اور گہرا کیا جائے تو اس رعایت طبائع کی بنیاد شفقت و کرم پر ہے کہ اس کے بغیر رعایت طبائع کا وجود ہی نہیں ہو سکتا پس رعایت طبائع کا کلیہ درحقیقت شفقت و رحمت کے اصول سے پیدا شدہ نکلتا ہے اور اس طرح اس موقع پر ایک کلیہ میں سے ایک اور گہرا کلیہ پیدا ہوا اور وہ رحمتِ ربانی کا اصول ہے پس جس طرح دعوت الی اللہ کے سہ گانہ طرق کی روح رعایتِ طبائع تھی۔ اسی طرح رعایتِ طبائع کی روح شفقت و رحمت ہے۔ اگر رحمت و شفقت کا اصول سامنے نہ ہو تو رعایت طبائع کی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی۔ پس رعایت طبائع باوجود کلیہ ہونے کے شفقت و رحمت کا ایک جزیہ ثابت ہوئی اصل اصول اور وسیع کلیہ رحمت و شفقت رہا اور ظاہر ہے کہ جب جزیہ کسی نص سے ثابت ہوتا ہے تو اس میں چھپا ہوا کلیہ بالاّ ولی اس نص سے ثابت ہو جاتا ہے اس لئے دعوت الی اللہ کے سلسلے میں مبلغ کیلئے رحمت و شفقت کا اصول بھی اسی آیت سے نکل آیا اور واضح ہو گیا کہ جبتک مبلغ کو اپنے مخاطبوں کے ساتھ شفقت نہ ہو اس کی تبلیغ دلوں میں گھر نہیں کر سکتی۔

اس کا مقتضا یہ ہے کہ مبلغ کی تمام تر ہمت صرف یہی نہ ہونی چاہیئے کہ وہ اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کر کے بری الذمہ ہو جائے اور اس برأۃ ذمہ ہی کو سب سے بڑا مطمح نظر سمجھ لے۔ خواہ مخاطب سُنے یا نہ سنے اور ملنے یا نہ مانے اور ہدایت پر آئے یا نہ آئے۔ نہیں بلکہ اُس کے دل میں باپ کی سی شفقت ہونی چاہیئے کہ وہ مخاطبوں کے راہِ راست پر لانے کی تدبیریں کرتے ہوئے دل میں یہ مقصد ٹھہرائے کہ کسی نہ کسی طرح وہ مخاطب کو ہدایت پر لا کر ہی مطمئن ہوگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تبلیغی رحمت وشفقت کو انتہائی حدود تک پہونچا دیا تھا اور جب کوئی ہدایت قبول نہ کرتا تو آپ رنجیدہ ہوتے، دل میں کڑھتے اور غمزدہ ہو جاتے حتیٰ کہ حق تعالیٰ کو اتنی غیر معمولی شفقت سے یہ کہہ کر روکنے کی نوبت آئی کہ:۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ

(ترجمہ) شاید آپ اپنے نفس کو ہلاک کر ڈالیں گے اس غم میں کہ یہ ایمان کیوں نہیں لائے۔

کہیں فرمایا:۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ

(ترجمہ) آپ ان پر کوتوال مقرر نہیں کئے گئے

کہیں فرمایا:۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ

رسول پر احکام پہونچا دینے کے سوا اور کوئی بات واجب نہیں۔

کہیں فرمایا:۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ

آپ جسے چاہیں اسے ہدایت نہیں دے سکتے

أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ — بلکہ اللہ جسے چاہے گا اسے ہدایت دیگا اور
يَّشَاءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ — ہدایت پانیوالوں کا علم بھی اسی کو ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اے پیغمبرؐ کڑھنے یا گھٹنے یا غمزدہ رہنے کی ضرورت نہیں آپؐ ان کے اوپر مسلط نہیں ہیں خدا نعہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے آپ کا کام تو صرف تبلیغ ہے۔

بہر حال جب مبلّغ کے لئے شفقت و رحمت کا اصول اسی آیت سے مستنبط نکلا تو ظاہر ہے کہ شفقت و رحمت کی جس قدر بھی جزئیات ہوں گی وہ بھی سب اسی آیت کے تحت میں آکر اسی آیت سے ثابت شدہ مانی جائیں گی خواہ وہ شفقتِ لسانی ہو یا شفقتِ قلبی و اخلاقی۔

دعوت میں نرمی و رأفت

مثلاً شفقتِ لسانی میں قول کی نرمی آتی ہے جو درحقیقت مبلّغ کی تبلیغ کا زیور ہے جس سے تبلیغ آراستہ ہو کر محبوبِ قلوب بن جاتی ہے اور قلوب کو اپنی طرف جذب کرلیتی ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل آواز کی کرختگی، زبان کی تیزی اور اخلاق کی شدت و غلظت دلوں کو چھیل ڈالتی ہے اور تبلیغ و مبلغ سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر کردیتی ہے اسی لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت و شفقت کا خصوصی ارشاد تھا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ — آپ اللہ کی بخشی ہوئی رحمت سے ان
لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا — لوگوں کے لئے نرم ہیں اگر آپ سخت زبان

غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ	اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے۔ آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے استغفار کیجئے۔

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے متمرد اور باغی کے حق میں نرمی قول کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ہوا۔

اِذْهَبَا اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰی	تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے اس سے نرم باتیں کہو شاید وہ یاد کرے اور خدا سے ڈرے۔

پھر جس طرح مبلغ کے لئے شفقتِ لسانی ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ شفقتِ قلبی اور اخلاقی کی ضرورت ہے کہ درحقیقت نرمیٔ زبان، نرمیٔ اخلاق ہی کے تابع ہے ہاں مگر چونکہ نرمی اخلاق کلام کی صفت نہیں بلکہ خود متکلم کی صفت ہے اس لئے اس کی جزئیات داعی الی اللہ کے عنوان کے نیچے آئیں گی۔

دعوت کو مؤثر بنانے کی تدابیر

اسی کے ذیل میں تمام وہ شفقت آمیز تدابیر بھی آجاتی ہیں جو تبلیغ کو مؤثر بنانے اور مخاطبوں کے دلوں کو کھینچنے کے لئے ضروری ہوں۔ مثلاً مبلغ کے لئے ضروری ہوگا کہ مخلصانہ تبلیغ کے ساتھ ایک ایسا ماحول بھی پیدا کردے جس کے ماتحت لوگ تبلیغ کی طرف خودبخود جھکتے چلے آئیں اور دائرۂ تبلیغ وسیع اور مقبول ہوجائے۔

فراہمی شوکت وقوت:۔ اس سلسلے میں چونکہ عام طبائع شوکت پسند ہوتی ہیں اس لئے تبلیغ کو مؤثر بنانے کیلئے مبلغ پر لازم ہے کہ تبلیغ کی پشت پر شوکت وقوت بھی کھڑی کردی جائے تاکہ شوکت پسندوں کو بھی اس کی طرف جھکنے سے چارۂ کار نہ رہے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ تبلیغ عام شروع کرنے سے پیشتر مقامِ تبلیغ کے بااثر افراد کو مقاصدِ تبلیغ سے مطلع کرکے ان کی ہمدردی حاصل کرلی جائے تاکہ بااثر اور باشوق مقامی افراد کی سرپرستی میں یہ پُرشوکت تبلیغ عوام کی توجہ کو جذب کرسکے اور اس کا حلقہ خودبخود وسیع ہوجائے۔

آخر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کیوں فرمائی تھی کہ الٰہی اسلام کو عزت دے، دو میں سے ایک کو حلقہ بگوشِ اسلام کر، عمر بن خطابؓ کو

عمرو بن ہشام (ابوجہل) کو ان میں سے جو بھی تجھے محبوب ہو۔

اس دعا کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ اسلام میں کس مپرسی کی بجائے شوکت کے آثار نمایاں ہو جائیں تاکہ شوکت پرست طبیعتیں بھی ادھر جھکنے لگیں یا ضعفاء کو شوکت کی پشت پناہی کا یقین ہو کر اپنی پستی اور کس مپرسی کا خطرہ نہ رہے اسی طرح تبلیغ بھی بسہولت ممکن ہو اور راستے کے فتنے اور موانع بھی دفع ہونے لگیں۔

چنانچہ فاروق اعظمؓ کے اسلام لاتے ہی اسلام مخفی گھروں سے نکل کر میدان میں آگیا اور اس کی تبلیغ میں آثارِ شوکت و قوت پیدا ہو گئے جس سے بہت سے وہ آرزومندانِ اسلام جو دل سے اسلام کے خواہاں تھے مگر مسلمانوں کی بیکسی اور غربت دیکھ کر اپنے مستقبل سے خائف تھے دائرۂ اسلام میں بے جھجک داخل ہونے لگے۔

جامعیت واجتماعیت :- یا مثلاً کسی موقع پر تبلیغ کو انفرادی کرنے کے بجائے جماعتی بنا دیا جانا قلوب کو کھینچ لانے میں زیادہ مؤثر ہے، فردِ واحد کا ایک ہی اثر ہے اور جماعت کا مجموعی اثر کچھ اور ہی ہے اسی لئے قرآنِ حکیم نے موقعہ بموقعہ جماعتی تبلیغ کا اسوہ بھی قائم فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا	(ترجمہ) اور ان کے سامنے اصحاب قریہ کی مثالیں پیش کیجئے کہ جب ہم نے ان کے پاس دو رسولوں کو بھیجا تو انھوں نے ان دونوں کو جھٹلایا، پھر ہم نے ایک

بِثَالِثٍ فَقَالُوٓا إِنَّآ إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ ۝ — تیسرے کا اور اضافہ کر کے ان کو مضبوط کیا اور انھوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

تنظیم و مرکزیت:۔ یا مثلاً تبلیغ کو منظم بنانے کی صورتیں پیدا کیا جانا کہ اس کی شاخیں ہوں وہ کسی مرکز کی طرف سمٹی ہوئی ہوں اس کا سرمایہ ایک بیت المال کی صورت سے منظم ہو، اس کا ایک امیر ہو جس کے ماتحت مبلغین نقل و حرکت کریں وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ قرنِ اول میں مسجد نبویؐ مرکز تبلیغ تھی اور وہیں سے جماعتیں اور افراد منتخب ہو کر تبلیغ کے لئے خدا کے ملک میں پھیلتے تھے اور سب کا رجوع اسی قبلۂ تبلیغ ... اور ذاتِ اقدس نبویؐ کی طرف رہتا تھا، گویا تبلیغ کا مرکز بھی تھا اور محیط بھی جس کے تمام خطوط مرکز کی طرف سمٹے دکھائی دیتے تھے اور اس مرکز سے محیط کی طرف پھیلتے ہوئے نظر پڑتے تھے اور اس طرح کارِ تبلیغ ایک پرکار کی طرح اپنے محور پر اعلیٰ نظم کے ساتھ گھومتا رہتا تھا جس نے صرف دس سالہ مدنی زندگی میں حجاز اور اس کے ماحول کو دائرۂ اسلام میں محصور کر دیا تھا اگر اس قسم کی تدابیر کے ماتحت فرائض تبلیغ ادا کئے جائیں تو لوگ اس پُر شوکت تبلیغ کی طرف خود بخود متوجہ ہونے لگیں گے اور ایک ایسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں لوگوں کو تبلیغی مقاصد کی طرف آنا سہل ہی نہیں بلکہ طبعاً پسندیدہ اور مرغوب محسوس ہونے لگے گا، اس سے یہ سمجھ لینا مشکل نہیں کہ اصل میں کارِ دعوت اسلامی حکومت کا منصب ہے جیسا کہ خلافتِ راشدہ نے انجام دیا۔ قرآن حکیم نے اسلامی شوکت و قوت کا بنیادی مقصد ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام

قرار دیا ہے جیسا کہ آیت تمکین سے واضح ہے۔

بہر حال آیتِ دعوت سے نفسِ دعوت اور اس کے اوصاف و طرق کے بارہ میں مذکورہ بالا مقامات مستنبط ہوئے اور ان کی ضروری تشریح آیت ہی سے کردی گئی۔ اب مدعوین کی شرح کا مقام آتا ہے جو اس دعوت کے مخالف ہیں کہ دعوت الی اللہ کے معیار سے ان کی اقسام اور ان کے اوصاف کیا ہوتے ہیں جن کی رعایت دعوت و ارشاد کے سلسلہ میں داعیوں کے ذمہ ہے اور یہ کہ مخاطب کس کس وضع اور قماش کے ہوتے ہیں کہ مبلغ کو ان کی ذہنی رفتار کا خیال رکھنا چاہیے۔

مدعوین اور اُن کی قسمیں

ظاہر ہے کہ دعوت کی یہ عرض کردہ انواع سہ گانہ اور ان کی اصناف و اوصاف جبکہ مخاطبوں کے متفاوت حالات کے معیار سے وضع کی گئی ہیں تو اسی سے مدعوین کی اقسام بھی خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ ایک طبعی اصول ہے کہ سامانِ دعوت مدعو کے مناسب مذاق ہی تیار کیا جاتا ہے۔ پس جبکہ اس دعوتی دستر خوان پر حصر کے ساتھ حجت کی تین نوعیں لا کر چنی گئیں تو یہی اس کی بھی صاف دلیل ہے کہ مدعو بھی دنیا میں تین ہی قسم کے ہو سکتے ہیں تاکہ ہر ایک نوع کے مناسب حجت کی نوع پیش کی جا سکے۔

اذکیا ء (حجت پسند) ایک وہ کامل الاستعداد طبقہ ہے جن کے قلوب روشن ہوں۔ علم کی صادق طلب اور معرفتِ حق کی سچی تڑپ ان میں بدرجۂ اتم موجود ہو اور وہ ہر مدعا میں صرف ایسی پختہ دلیلوں اور حجتوں کے طلب گار رہے ہوں جو یقینی ہوں اور دلوں میں نورِ یقین پیدا کر سکیں ظاہر ہے کہ ایسے افراد سے خطاب کی صورت بجز دلائل قطعیہ کے دوسری نہیں ہو سکتی اور اسی کا نام قرآن کی زبان میں حکمت ہے جو آیت اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ میں مذکور ہے۔

۲- اغبیار (منازعت پسند)

اس کے بالمقابل بلکہ اس کی ضد ایک وہ کج فہم طبقہ ہے جن کی طبیعتوں میں سلامتی اور ذوق تحقیق کے بجائے بحث و نزاع، کج بحثی اور کٹ حجتی کے جراثیم بھرے ہوئے ہوں، ان کے نزدیک سب سے بڑا کمال صرف بولتے رہنا اور خاموش نہ رہنا ہے نہ ان کی بدمزاقی کسی فطری حجت و دلیل کو برداشت کرتی ہے اور نہ انھیں کوئی عقلی استدلال مطمئن کرسکتا ہے اس لئے ان کے حق میں محققانہ کلام سودمند ہی نہیں ہوسکتا بلکہ سم قاتل کا حکم رکھتا ہے انھیں صرف ایسا معارضہ اور الزام ہی خاموش کرسکتا ہے جو ان کے مسلمات کی رو سے ہو اور اسی رنگ احتجاج کو مجادلہ کہا گیا تھا اس لئے کج بحثوں کے حق میں حکمت کا کلمہ مفید نہیں ہوسکتا بلکہ صرف مجادلہ جس کے مقدمات اگر مسلمہ فریقین ہوں تو اسی کا نام لسان قرآن میں مجادلہ حسنہ ہے۔ پس قرآن نے مجادلہ حسنہ کا باب قائم فرمایا تو گویا اس نے یہ بھی بتادیا کہ مدعوین کا ایک طبقہ مجادلہ پسند اغبیار کا بھی ہے جس کے سامنے حکمت کے بجائے مجادلت سے ہی کام لینا چاہیئے

۳- صلحا ر (سلامت پسند)

پھر ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک بین بین طبقہ ہے جو نہ تو کمال فہم اور سلامتیٔ ذوق میں حکمار و عقلار کی حد تک پہونچا ہوا ہے جس کی تسلی خاطر کے لئے دلائل قطعیہ اور حکمت درکار ہو اور نہ بدذوقی میں اس کا حال اغبیار اور کج بحثوں کا سا ہے کہ اس کے خاموش کرنے کے لئے الزامی حجت اور مجادلہ کی نوبت آئے بلکہ ایک درمیانی حد میں سادہ فطرت اور خلقی سلامت روی پر ہوتا ہے جس کی تفہیم کے لئے

واعظانہ خطابیات اقناعی دلائل، سادہ مثالیں، عام فہم لطائف اور عبرت انگیز حکایات ہی کافی ہیں۔ قرآن مجید نے اسی طبقہ کے لئے موعظہ حسنہ کے طرز خطاب کو اختیار کرنے کا امر فرمایا ہے۔

بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ اگر حصر کے ساتھ حجت بیانی کے یہ تین ہی طریقے نکلتے ہیں حکمت، مجادلت اور موعظت تو ان کے مقتضیٰ کے مطابق حجت نیوش افراد بھی تین ہی طبقوں میں منحصر نکلے۔ عقلاء، اغبیاء اور صلحاء اور ہر ایک طبقہ ایک ایک طریقہ کا مقتضاء نکلا۔

یعنی حکمت عقلاء کو چاہتی ہے، مجادلت اغبیاء کو کھینچتی ہے اور موعظت صلحاء کا تقاضہ کرتی ہے۔ اسی لئے آیت دعوت کے ان تین منصوص طرق حجت کے مقتضاء سے مخاطبوں کی یہ تین انواع پیدا ہو کر درحقیقت آیت ہی سے ثابت شدہ نکلیں۔

سماعتِ دعوت کے آداب

سماعِ قبول

مخاطبوں کی اس اقتضائی تقسیم سے ان کا ایک اوّلین وصف حسنِ سماع ہے جو یہاں سے نکلتا ہے جو ان میں بتقاضائے عقلِ راسخ رہنا چاہیے۔ جس کا ثمرہ جذبۂ قبولیت اور تسلیم حق ہے یعنی مخاطب کا جوہر یہ ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کو سماعِ قبول سے سنے اور بشرطِ معقولیت ملنے اور حق ہونے کی صورت میں اُسے تسلیم کر لینے کا جذبہ اپنے اندر رکھے جسے داعی بھی اُن میں پیدا کر سکتے ہیں جو اسی آیت کے اقتضاء سے ثابت ہو رہا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جبکہ حجّت بیانی کی یہ سہ گانہ قسمیں محض مخاطبوں کے فہم کے تفاوت اور ان کی سمجھ کے مختلف درجات کی وجہ سے بیان فرمائی ہیں تو ان کی غرض و غایت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مخاطب کو انکار کی گنجائش نہ رہے اور بشرطِ عقل و انصاف وہ کلمہ حق کو قبول کرنے پر اپنے دلی داعیہ سے مجبور ہو جائے۔ اگر یہ غرض نہ ہوتی تو استدلال اور حجت بیانی اور ان کے مختلف طریقوں کی حاجت ہی نہ تھی محض احکام کا بیان کر دیا جانا کافی تھا خواہ کوئی سُنے یا نہ سُنے اور خواہ قبولیت کی اس میں گنجائش اور استعداد ہو یا نہ ہو۔ گویا داعی الی اللہ صرف اس کا مصداق ہوتا ہے کہ ؏

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم!

سوءِ سماع اور جبکہ مخاطبوں کی اس تقسیم سے قدرتاً مخاطب کا یہ وصف سامنے آیا تو یہ حسنِ سماع بطور اقتضاء کے اسی آیت سے ثابت ہو گیا۔ اب غور کرو تو اس سماعِ قبول کے اثبات سے اس کی ضد جیسے سوءِ سماع یا حق سے انحراف کہنا چاہیئے جو قلب میں دعوت کو راسخ نہ ہونے دے مع اپنی تمام اقسام کے اسی آیت کے مفہوم سے خود بخود منفی ہو جاتی ہے۔

لہوِ قلب یا مثلاً قلب کا لہو و لعب اور لا اُبالی پن۔ قلتِ فکر یا قلبی اعراض اور بے توجہی یا زبان کی بکواس یا کثرتِ سوال اور فضول استفسارات یا دور از کار احتمالات و شبہات نکالنا جو کلام کو رُلانے کے لئے کئے جائیں جن کی طبعی خاصیت ہی یہ ہے کہ مخاطب کے دل میں داعی کی بات جمنے نہ دیں اور اس پر کسی حیثیت سے بھی متکلم کا اثر نہ ہونے دیں یہ سب اسی آیت دعوت سے مردود ہو جاتے ہیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ الامر بالشیٔ یقتضی النہی عن ضدہ (کسی شے کا حکم دینا اس کی ضد کی ممانعت کی دلیل ہوتا ہے) پس جب حسنِ قبول آیت کے اقتضاء سے ضروری اور مامور بہ ٹھہرا تو اس کی ضد سوءِ قبول مع اپنی اقسامِ مذکورہ کے خود ہی ممنوع ثابت ہوئی۔

سامع کے ان قبیح اوصاف پر قرآن حکیم نے جدا جدا بھی روشنی ڈالی ہے۔

اعراض مثلاً قلبی اعراض اور بے توجہی پر ملامت کرتے ہوئے ہٹ دھرموں اور متعصبوں کی شان بتائی کہ:۔

وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ — اور اگر وہ ان کو سنائیں گے بھی تب بھی

لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ — وہ پشت پھیر کر چلے جائیں گے اس حال میں کہ وہ اعراض کرنے والے ہوں گے

دوسری جگہ فرمایا:۔

بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ — بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرنے والے ہیں۔

شغب و اضلال

یا مثلاً حق پہونچانے کے وقت معاندوں کے شور وشغب کے بارہ میں قرآن حکیم نے دوسری جگہ اُن کی یہ خصلت تفصیل سے بیان فرمائی ہے کہ کلامِ حق کو سرے سے سننے ہی کا ارادہ نہیں رکھتے چہ جائیکہ سماعِ قبول سے سنتے اور نہ صرف یہ کہ خود سننا نہیں چاہتے بلکہ شور وشغب کرکے دوسروں کو بھی سننے نہیں دیتے۔ فرمایا:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ — اور کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو مت سنو اور شور مچاؤ تاکہ تم غالب آجاؤ۔ (کہ دوسرے بھی نہ سن سکیں)

استہزاءِ دعوت

یا مثلاً قلبی لہو ولعب کے بارے میں فرمایا:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا — اور بعض لوگ وہ ہیں جو لغو اور فضول باتیں خریدتے ہیں تاکہ اللہ کے راستہ سے بغیر علم کے گمراہ کردیں اور اس کو تمسخر اور استہزاء بنادیں۔

یا مثلاً حدیث میں کثرت سوال کی ممانعت فرمائی گئی جو محض قیل وقال کے لئے ہو اور جس سے کسی واقع شدہ شک کا مٹانا مقصود نہ ہو بلکہ ان ہوئے شکوک وشبہات پیدا کرکے کلام کو مشکوک بنا دینا پیش نظر ہو۔

نھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن کثرۃ السوال وعن قیل وقال وعن اضاعۃ المال (مسلم)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سوال۔ قیل وقال اور اضاعت مال سے منع فرمایا ہے۔

غرض یہ آدابِ مخاطب بتقریر بالا اسی آیت کے تقاضا سے ثابت ہوتے ہیں۔

داعی اور اس کے اوصاف

ذاتی اوصاف

اب جبکہ مدعوالیہ (دعوتی پروگرام) دعوت اور مدعو کی اقسام وانواع اور متعلقہ احوال آیتِ دعوت کے ماتحت روشنی میں آچکے تو اب داعی اور مبلغ کا درجہ آتا ہے کہ اس کے اوصاف اور آداب وشروط پر اس آیت نے کیا روشنی ڈالی ہے اور مبلغین کے لئے اس سے کیا کیا ہدایتیں مستنبط ہوتی ہیں جبکہ ہدایت وتبلیغ کی کامیابی بہت حد تک مبلغ ہی کے ذاتی اوصاف، اس کے کیریکٹر اور اس کی علمی قابلیت پر موقوف ہے اس لئے دعوت کے سلسلہ میں داعی کے احوال کا موضوع سب سے زیادہ اہم ہے اور مبلغوں کا فرض ہے کہ اسے زیادہ غور سے پڑھکر اپنی زندگی کو اس مستنبط دستور العمل پر ڈھالنے کی انتہائی سعی کریں، اگر وہ صحیح معنی میں مبلغ بننا اور حقیقتاً اپنی تبلیغ کو مؤثر بنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے اسی لئے اس موضوع کو سب سے آخر میں رکھا ہے تاکہ ختمِ کلام پر یہ موضوع خصوصیت سے قلوب میں اپنا اثر چھوڑ جائے۔

جہاں تک غور کیا گیا اس آیت سے بلاواسطہ یا بالواسطہ دُعاۃِ امت کے وہ اوصاف جن پر تبلیغ ودعوت کے مؤثر ہونے کا دار و مدار ہے اصولاً دو قسم کے نکلتے ہیں ایک وہ جو مبلغ کی ذات کے لئے بطور اس کے وصف کے ضروری

ہیں۔ اور دوسرے وہ جو اس کے فعل تبلیغ کے لئے اس میں ناگزیر طور پر ہونے چاہئیں جن کے بغیر اس کے مخاطبوں پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

علم وبصیرت

ذاتی اوصاف کے سلسلے میں سب سے پہلی چیز مبلغ کے لئے علم وبصیرت ہے جس سے تبلیغ کی اساس قائم ہوتی ہے کیونکہ شرعی مقاصد کی تبلیغی اساس ظاہر ہے کہ جہالت نہیں ہو سکتی، جاہل تبلیغ ہی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ اس کے مؤثر غیر مؤثر ہونے کی بحث سامنے آئے کیونکہ تبلیغ کی حقیقت ایصال (پہونچانا) ہے اگر خود مبلغ ہی میں وہ چیز نہ ہو جو پہونچائی جانی چاہیئے تو وہ پہونچا کس چیز کو سکتا ہے؟ اور اگر علم کے درجہ میں ہو لیکن اس کے پہونچانے کا ڈھنگ اسے نہ معلوم ہو تو اس کا پہونچانا مؤثر کیسے ہو سکتا ہے؟

پس حق تعالیٰ نے جب دعوت الی اللہ کے تین طریقے حکمت، موعظت اور مجادلت تجویز کئے اور دعوتی پروگرام سبیل رب کو بتلایا، گویا سبیل رب موجود نہ ہو تو دعوت کا وجود نہیں ہو سکتا اور حکمت و موعظت اور مجادلت نہ ہو تو دعوت کا ڈھنگ درست نہیں رہ سکتا۔ تو اس کے صاف معنی یہ نکلے کہ مبلغ سبیل رب کا عالم بھی ہو جسے وہ پہونچائے اور حکمت و موعظت اور مجادلت میں ماہر بھی ہو جس سے وہ اپنا پیام مؤثر بنائے۔

مبلغ کے حق میں ضروری ہے کہ وہ کوئی پیشہ ور واعظ یا محض لیکچرار یا کوئی بندھا ٹکا اخبار کی قسم کا مقرر نہ ہو بلکہ سبیل رب کے مسائل اور انواع دلائل کا عالم ہو جسے مناسب وقت پر حجت و برہان کے انتخاب کرنے میں جہالت مانع نہ ہو پس اس آیت سے اگر سبیل رب کی دعوت ضروری ہے تو دا عی میں اس کا

علم و بصیرت ہونا بھی اسی آیت سے ضروری ہے۔

فہم و فراست

اور جبکہ سہ گانہ انواع حجت کا عالم ہونا مبلغ کے لئے ضروری ہوا۔ اور یہ تین طریقے تین ہی قسم کی جماعتوں کے لئے تجویز فرمائے گئے جن میں سے ایک ایک طبقہ کے لئے مخصوص ہے تو قدرتی طور پر یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ مبلغوں میں مخاطبوں کے ان طبقات کی تشخیص کا فہم اور تدبر بھی ہونا چاہیئے تاکہ وہ یہ اندازہ کر سکے کہ آیا اس وقت مخاطب اس کے عقلاء اور فلسفی مزاج لوگ ہیں یا سادہ لوح اور سلیم الطبع اشخاص یا کج فہم اور کج بحث افراد ہیں جن کے مناسب وہ حکمت اور مجادلت کے ڈھنگ کا انتخاب کر سکے اگر وہ ان طبقات اور ان کی ذہنیتوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو گو انواعِ دلائل کا کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو اس کی تبلیغ کبھی مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ فرض کیجیئے کہ سامنے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے ڈگری یافتہ افراد کا اجتماع ہو جنہیں چوبیس گھنٹے عقلیت ستاتی رہتی ہو اور اس۔ لئے وہ دینی مقاصد کو اپنے اس مذاق کے مناسبِ حال دلائل سے فلسفیانہ رنگ میں سمجھنا چاہتے ہوں اور چاہتے ہوں کہ قرآن ان کے سامنے ضرور پیش کیا جائے مگر انھیں کی زبان میں پیش کیا جائے۔ اگر آپ انھیں واعظانہ خطابیات اور اقناعی دلائل سے سمجھانے لگیں جو ایک خالی الذہن اور تشنۂ ہدایت طالب کے سامنے اختیار کیا جاتا ہے۔ یا الزام پسند طبقہ کے سامنے حکیمانہ حقائق کا اظہار کرنے لگیں یا سادہ لوحوں کو الزامی حجتوں سے عاجز کرنے لگیں تو کیا یہ تبلیغ کوئی اچھا اثر پیدا کر سکے گی؟ نہیں بلکہ محض صدا بہ صحرا ثابت ہوگی؟ اور اس کا کوئی

بھی اثر مخاطبوں پر نہ پڑ سکے گا؟ بلکہ اس صورت میں سامعین مبلغ کی ذات کے بارہ میں بُری رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مبلغ سے حسن عقیدت مٹ کر اس کی تبلیغ ہمیشہ کے لئے بے اثر بلکہ مسدود ہو جائے گی۔ گویا نافہم مبلغ اپنی نافہمانہ تبلیغ سے خود تبلیغ کے راستہ میں نادانستہ روڑے اٹکاتا رہتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ مبلغ ہو کر تبلیغ کے بارہ میں کیا عملِ جراحی کر رہا ہے۔

بہر حال نافہم عالم اور بے بصر مبلغ کے علوم و معارف اسی طرح بے محل ضائع ہوتے رہتے ہیں جس طرح چٹیل میدانوں میں بارش کہ نہ جذب ہی ہوتی ہے کہ سبزہ اُگے اور نہ جمع ہی ہوتی ہے کہ ذریعۂ سیرابی بنے۔ اسی لئے ارشادِ نبوی ﷺ ہے:۔

كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ	لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق کلام کرو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا:۔

لَا تُعَلِّقُوا الْجَوَاهِرَ بِاَعْنَاقِ الْخَنَازِيْرِ	جواہرات خنزیروں کی گردنوں میں نہ باندھو۔

اس لئے داعی میں فہم و فراست کی ضرورت بھی اس آیت کا مقتضاء ثابت ہوتی ہے۔

دانش و خلق پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ تبلیغ میں فہم و فراست کے ساتھ دانش و عقل اور اخلاقِ اسلامی بھی درکار ہیں

کہ ان دو جوہروں کے بغیر دعوت الی اللہ کی کوئی ایک نوع بھی اپنے پاؤں نہیں چل سکتی کیونکہ یہ تو پہلے واضح ہو ہی چکا ہے کہ دعوت الی اللہ کے یہ تینوں طریقے حکمت، موعظت، مجادلت اچھے ڈھنگ سے ہونی چاہئیں جو سامعین کے قلوب میں اچھا اثر پیدا کر سکیں چنانچہ اسی لئے مجادلہ میں بالتی ھی احسن کی قید لگائی گئی۔ موعظت میں حسنہ کی قید لگائی گئی اور حکمت کے لفظ ہی میں حسن وخوبی مرعی رکھی گئی تاکہ کوئی نوع بھی اس مؤثر حسن وخوبی سے خالی نہ رہے ادھر یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دعوت کا اچھا ڈھنگ اس کے مناسب حال جداگانہ ہے۔ اب اگر غور کیا جائے تو ان میں سے کسی ایک دعوت کا اچھا ڈھنگ بھی بغیر عقل ودانش اور اخلاق حسنہ کے اچھا نہیں رہ سکتا کیونکہ مجادلہ کا اچھا ڈھنگ یہ ہے کہ معاند اور کج بحث مخاطب کے روبہ سے پیشانی پر بل نہ لایا جائے متانت سے اس کی کج بحثیاں سن کر الزامی حجت سے اُسے لاجواب بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بغیر ضبطِ نفس اور صبر کے جو اُمّ الاخلاق ہے اور بغیر عقل ودانش کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر مبلغ میں دانش نہ ہو تو الزامی حجت کی طرف اس کا ذہن ہی منتقل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ضبطِ نفس نہ ہو تو وہ اپنے آپے ہی میں نہیں رہ سکتا کہ متانت کا مظاہرہ ہو سکے۔ اسی طرح موعظت کو بھی حسنہ بنانے میں عقل و دانش کی ضرورت اس لئے ہے کہ تبلیغ کا مضمون ایسے پاکیزہ عنوان اور ڈھنگ سے بیان کیا جائے کہ سادہ لوحوں کے دل روشن ہو جائیں اور وہ حقیقت کا اعتراف کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اِدھر اخلاق کی اس لئے ضرورت ہے کہ ان

سادہ لوحوں کی بے تمیزی اور بدویت سے جو عموماً ایسے افراد سے سرزد ہوتی ہے مبلّغ پر کوئی اثر نہ پڑے۔ ایسے ہی عقلاء سے خطاب کرنے میں بھی عقل و دانش تو اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر کلامِ حکمت اور دلائل بیّنہ ذہن میں منضبط ہی نہیں ہو سکتے اور ضبطِ نفس یا اخلاق کی اس لئے ضرورت ہے کہ جب بال کی کھال نکالنے والے اذکیاء دقیق دقیق شبہات و سوالات پیش کرتے ہیں تو عادۃً مبلّغ میں ایک قسم کی جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اگر وہ اپنے اخلاق سے اس پر غالب نہ آئے تو اس کا کلامِ حکمت کسی حکمت پسند کے سامنے ہی نہیں آ سکتا اور اس صورت میں مبلّغ آپے سے باہر ہو کر اپنی ساری تبلیغی عمارت کو خود ہی اپنے ہاتھوں سے گرا دے گا۔

پس خطاب اذکیاء و اغبیاء سے ہو یا صلحاء سے بہر صورت نفسِ خطاب کے حسن میں عقل کی اور مخاطبوں کی خصوصیات کے لحاظ سے ضبطِ نفس اور حُسنِ خلق کی ضرورت ہے ورنہ اس کے بغیر مجادلہ و موعظت اور حکمت کا وہ اچھا ڈھنگ جو قرآن کو مطلوب ہے یعنی مجادلہ کا بالتی ھی احسن ہونا موعظت کا حَسَنَہ ہونا اور حکمت کا فی نفسہٖ حَسَنْ ہونا وجود پذیر ہی نہیں ہو سکتا۔

قابلیت کے مناسب طبقات کا انتخاب

ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے

کہ جس طرح انسانی طبقات کے مراتب و درجات بے انتہا ہیں اسی طرح علم کے مراتب بھی بیشمار ہیں جسے جس درجہ کا علم و خُلق حاصل ہو اس پر اسی درجہ کی تبلیغ ضروری ہے اور وہ اپنی ہی قابلیت کے مناسب انسانی طبقات منتخب

کر سکتا ہے جو اس کی قابلیت سے مستفید ہو سکتے ہیں مثلاً ایک شخص اپنی اعلیٰ حکمت سے فلسفیوں کو تبلیغ کر سکتا ہے اور دوسرا اپنی ادنیٰ حکمت سے معمولی پڑھے لکھوں کو سمجھا سکتا ہے اور تیسرا اپنی کمتر حکمت سے کورے اَن پڑھوں کو ہی راہِ راست پر لا سکتا ہے تو ان میں سے ہر ایک پر اپنے مناسب طبقہ کو تبلیغ کرنا فرض ہو گا۔ یا مثلاً بعض لوگ فقط جزئیاتِ مسائل کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ بعض لوگ ان کو فقہی رنگ میں سمجھا سکتے ہیں اور بعض ان کی تفہیم فلسفیانہ انداز میں بھی کر سکتے ہیں تو جس کو بھی اپنے رنگ کا طبقہ مل جائے اسے تبلیغ سے روگردانی جائز نہ ہو گی۔ یہی صورت موعظت اور مناظرہ کی بھی ہے۔ اَن پڑھوں کے لئے معمولی استعداد کے لوگوں کا وعظ و مجادلہ مؤثر ہو جاتا ہے اور فلسفی مزاجوں کے لئے اونچی استعداد کے افراد ہی کی موعظت و مجادلت کارگر ہوتی ہے اس لئے جب بھی جس مبلغ کے حسبِ حال جماعت اس کے سامنے آ جائے اسے حکمت و موعظت اور مجادلت سے غافل رہنا جائز نہ ہو گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی صورت میں بھی مسلمان کے لئے تبلیغ سے کنارہ کشی جائز نہیں کہ ہر مسلم جتنا ایمان رکھتا ہے اُتنا ہی علم و معرفت بھی رکھتا ہے اور اسی کے انداز سے تبلیغ کا مکلّف بھی ہے اب اگر ان طبقات کا وجود اور اُن کے انتخاب کی ضرورت اس آیت کی رو سے ضروری ہے اور بلاشبہ ضروری ہے تو اس انتخاب کے لئے مبلغ میں عقل و خُلق کا استعمال بھی درجہ بدرجہ اسی آیت کی رو سے ضروری ثابت ہوتا ہے۔

سیرت و کردار | پھر مبلغ کے لئے جیسے علم و بصیرت، فہم و فراست اور دانش

وعنق ضروری ہے، ایسے ہی عمل صالح اور تقوی وطہارت کی بھی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر تبلیغ کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہو سکتا دلائل و براہین اور پرجوش تقریریں وہ اثر نہیں دکھلا سکتیں جو ایک مبلغ کی ذاتی سیرت اور عملی زندگی اس کے سادہ کلام میں اثر پیدا کر دیتی ہے۔ نیک عمل مبلغ حقیقتاً خدا کی حجت اور اس کی آیات میں سے ایک آیت ہوتا ہے جسے دیکھ کر خود بخود ہزاروں دلائل سامنے آجاتے ہیں اور ہزارہا کج قلوب کا معالجہ خود اس کی ذات اور عملی زندگی بن جاتی ہے ؎

اے لقاء تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اہل دل کا قد و قامت، زاہدانہ لباس، نورانی چہرہ، قانعانہ زندگی اور عاشقانہ ہیئت خود ایک مستقل حجت و فلسفہ ہوتی ہے جو دلوں کو سکون و طمانیت بخشتی ہے حضرات صحابہؓ ورودِ ہند کے وقت جب سندھ میں پہونچے اور سندھ کے بازاروں سے ان کا گذر ہوا تو ہزارہا انسان محض ان کے چہرے بہرے دیکھ کر ایمان لے آئے اور ان کے دلوں نے شہادت دی کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہو سکتے۔ گویا کفار و مشرکین کے دلوں سے کفر کا زنگ اور شکوک و شبہات کی آلودگیاں بغیر کسی سوال و جواب کے محض ان مقدسین کی عملی زندگی نے دھو ڈالیں اسی لئے قرآن حکیم نے امر بالمعروف کے وقت خطباء کو پُرزور ہدایت فرمائی ہے کہ وہ جو کچھ دوسروں کو بتلائیں پہلے خود بھی اس پر عمل کریں اور جو کچھ کہیں وہ کر کے بھی دکھلائیں۔ ارشاد حق ہے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ	کیا تم لوگوں کو نیکی کا امر کرتے ہو اور خود
تَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ	اپنے آپ کو بھول جاتے ہو درانحالیکہ

تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو تو پس کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

دوسری جگہ فرمایا

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ

اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے تم کرتے نہیں اللہ کے نزدیک یہ بات بہت بُری ہے کہ تم وہ کہو جسے تم خود نہ کرو۔

بہرحال جبکہ اس آیتِ دعوت میں دعوت کے ساتھ اس کی تاثیر بھی مطلوب ہے ورنہ بے اثر دعوت بے نتیجہ دعوت ہے اس لئے تاثیر کے سارے طبعی اسباب بھی اسی آیت کی رُو سے ضروری نکلتے ہیں جن میں سے اہم ترین سبب داعی کی سیرت وکردار ہے جس کی طرف آیت میں حکمت، موعظت اور مجادلت سے اشارہ فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر دعوت کے لئے حکمت ضروری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ داعی حکیم ہونا چاہیئے اور اگر موعظت ضروری ہے تو حاصل یہ ہوا کہ داعی کو ناصح و واعظ ہونا چاہیئے اور اگر مجادلت ضروری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ داعی کو مناظر ہونا چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ حکیم، واعظ اور مناظر ہونا داعی کی سیرت وکردار کے سوا اور کیا چیز ہے؟ نیز حکمت کے جس قدر لوازم ہیں وہ حکمت کے تحت آیت کی رُو سے ضروری اور ثابت شدہ سمجھے جائیں گے اور موعظت و مجادلت کے لئے جو اُمور ضروری اور لازم ہیں وہ ان الفاظ کے تحت آیت سے ثابت شدہ مانے جائیں گے۔

دعوت کی عملی ترتیب

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تبلیغ میں ایک خاص ترتیب قائم فرمائی ہے جس کی ابتداء خود مبلّغ کی ذات سے کی ہے یعنی مبلّغ پہلے اپنے نفس کو تبلیغ کرکے اُسے نمونۂ عمل بنا کر دکھائے۔ پھر اپنے اہل وعیال کو تبلیغ کرکے انھیں عمل کا نمونہ بنائے پھر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اپنے مقاصد سمجھا کر نمونۂ عمل بنائے، پھر اپنے شہر اور اس کے مضافات میں عمل کے نمونے قائم کرے تب کہیں بیرونی دنیا تک تبلیغ کا درجہ آتا ہے چنانچہ قرآن شریف نے اسی ترتیب کو قائم کرنے کے لئے اولاً تبلیغ نفس اور پھر اہل خانہ کے بارہ میں فرمایا۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا	اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ۔

پھر رشتہ داروں کے بارہ میں فرمایا:۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ	اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈرائیے۔

پھر اہلِ شہر، مضافاتِ شہر اور عام اہل ملک کے بارہ میں فرمایا:۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ	تاکہ اہلِ شہر کو اور جو اُن کے قرب وجوار میں رہتے ہیں ان کو ڈرائیں آپ اُن

يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ — لوگوں کو اس جمع ہونے کے دن سے ڈرائیں جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

اور سب سے آخر میں عام دنیا کے لئے فرمایا:۔

لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا — تاکہ پیغمبر تمام اہل عالم کیلئے نذیر ہوں

اس ترتیب سے صاف واضح ہے کہ تبلیغ کا آغاز اپنے نفس سے کر کے پھر علی الترتیب اس کے دائرہ کو وسیع کیا جانا ہی تبلیغ کو موثر اور ہمہ گیر کر سکتا ہے بہر حال تبلیغ کا دلوں میں اثر انداز ہونا مبلّغ کی ذاتی صلاحیت و عمل پر موقوف ہے کہ بسا اوقات صلاح و عمل کی یہ خاموش زبان ہی تبلیغ کا کام کر جاتی ہے اور بلا کسی تقریر و موعظت کے قلوب فتح ہو جاتے ہیں جو تبلیغ کا اصل مقصد ہے۔

اگر کہا جائے کہ تبلیغ کے لئے سبیل رب کا علماً موجود ہونا کافی ہے اس پر خود عامل ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ حقیقی علم بلا عمل کے باقی ہی نہیں رہ سکتا اولاً اس کی بصیرت اور نورانیت مٹتی ہے اور پھر وہ خود ختم ہو جاتا ہے کہ علم کا تحفظ بلکہ بقاء صرف عمل ہی سے ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:۔

هتف العلم بالعمل فان اجاب والّا ارتحل — علم عمل کو پکارتا ہے اگر اس نے لبیک کہا تو خیر ورنہ پھر علم بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

(جامع فضل العلم لابن عبد البرؒ)

خشیتِ الٰہی و عدم خشیتِ خلائق

مبلّغ کے ان ذاتی اوصاف کے سلسلہ میں جن پر تبلیغ کے اثرات

موقوف ہیں سب سے بڑا اور اہم وصف مخلوق سے نڈر ہونا اور اللہ سے ڈرنا ہے بعنوانِ دیگر حق کے معاملہ میں جرأت و بیباکی کا ہونا اور مرعوبیت مداہنت کا نہ ہونا ہے۔ گویا مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ حق اور احکامِ حق کی عظمت کے مقابلہ میں کسی کی عظمت کا خطرہ اس کے قلب میں نہ ہو جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ مخلوق کا تو کوئی خوف تبلیغ حق میں مانع نہ ہو اور خالق کا خوف تبلیغِ حق کے لئے داعی ہو۔ انبیاء علیہم السلام جو سرچشمۂ تبلیغ ہیں اس وصفِ خشیتِ الٰہی اور عدمِ خشیتِ خلائق میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور راسخ القدم ہوتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ	جو لوگ اللہ کے پیغامات پہونچاتے ہیں
اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ	اور اللہ سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ
اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَ کَفٰی	کے کسی اور سے خوف نہیں کرتے اور اللہ
بِاللّٰہِ حَسِیْبًا	ہی کافی ہے۔

غور کرو تو اس آیتِ مکوت سے یہ وصف بھی صاف طور پر نکل رہا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ مخاطب کو اگر کسی چیز کی محض ترغیب دی جائے تو اس کے امتثال پر ترغیب دہندہ کی محض خوشنودی مرتب ہوتی ہے لیکن اگر کسی چیز کا حکم دیا جائے جو لازم اور اٹل ہو تو اس کی تعمیل کی صورت میں حاکم کی پوری ذمہ داری اور قوت محکوم کے ساتھ ہوتی ہے کیونکہ بصورتِ تعمیل حکم کام حاکم کا انجام پاتا ہے نہ کہ محکوم کا، محکوم محض ایک واسطۂ تعمیل ہوتا ہے۔ پس ترغیب کی صورت میں تو مخاطب کے لئے یہ گنجائش ممکن تھی کہ وہ کسی کے ڈر اور خوف سے اس کام کو نہ کرے کیونکہ کام کی ذمہ داری خود اسی کرنے والے پر آتی ہے لیکن حکم کی صورت میں اس کی گنجائش

ہی نہیں ہے کہ قوی حاکم کے احکام کی تعمیل میں کسی اپنے جیسے سے ڈر کر پس و پیش کیا جائے کیونکہ حاکم کی پوری حاکمانہ طاقت اور ذمہ داری اس کی پشت پر ہے۔ اس صورت میں اگر ڈر ہو سکتا ہے تو صرف حاکم کا نہ کہ رعایا کا۔ پس تعمیلِ حکم کی صورت میں صرف حاکم سے ڈرنا اور اس کے سوا رعایا میں سے کسی سے نہ ڈرنا خود حکم حاکم کا مقتضا ہے۔

اس صاف و صریح قاعدہ کو پیشِ نظر رکھ کر اب اگر آیتِ دعوت پر غور کیا جائے تو واضح ہو گا کہ یہاں دعوت الی اللہ کی ترغیب نہیں دی جا رہی ہے کہ یہ تبلیغ و دعوت مبلغ کے حق میں اس کا کوئی ذاتی کام ٹھہرے اور خود اس کی اپنی ہی ذمہ داری ہو بلکہ احکم الحاکمین کی طرف سے جو حکمِ محکم دیا جا رہا ہے جس سے واضح ہے کہ یہ کارِ دعوت و تبلیغ درحقیقت سرکاری کام ہے مبلّغ کا ذاتی نہیں اور اس لئے اس کے نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی خود خدا پر ہے نہ کہ مبلّغ پر۔ اس لئے مبلّغ کے حق میں خوف و خشیت الٰہی خود اس حکمِ دعوت کا طبعی تقاضا ٹھہر کر اس آیت سے ثابت شدہ ہو جاتا ہے۔

استغناء

داعیٔ دین کے ذاتی اوصاف کے سلسلے میں ایک آخری اور بنیادی وصف استغناء ہے جس کے بغیر تبلیغ کا وقار اور احترام قائم نہیں ہو سکتا۔ لالچی اور خود غرض انسان کبھی میدانِ تبلیغ کا مرد نہیں بن سکتا اور نہ کبھی بیباکانہ تبلیغ کر سکتا ہے گویا خشیت اللہ کے بجائے خشیت الخلق درحقیقت لالچ اور طماعی ہی سے پیدا ہوتا ہے اور مبلّغ کے قلب میں جب اپنے مستفیدوں سے طمع پیدا ہو گئی تو یقیناً وہ ان کا محتاج ہو گیا اور محتاج انسان کمزور ہوتا ہے

اور جب معلّم کمزور اور ذلیل ہو اور متعلم قوی اور حاوی ہو تو معلّم و مبلّغ میں تبلیغ حق کی حقیقی جرأت پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ مخاطبوں پر اپنا اثر قائم کر سکتا ہے

ع آز بگذار و بادشاہی کن

اس لئے مبلّغ کا سب سے بڑا جوہر استغناء اور خودداری ہے جس کی پہلی علامت اُن سے لالچ اور طمع کا قطع کر دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام نے تبلیغی مساعی کے سلسلہ میں خوف و خشیتِ الٰہی اور اتباعِ رسالت کا وعظ سنانے سے پیشتر اپنے جس وصف کا کھول کھول کر اعلان کیا وہ سوائے استغناء اور قطعِ طمع کے دوسری چیز نہ تھی چنانچہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم الصلوٰۃ والسلام کے تبلیغی مواعظ کے سلسلے میں قرآن نے سب کا ایک ہی قول نقل کیا ہے۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ	میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ	میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمّہ ہے
الْعٰلَمِيْنَ فَاتَّقُوا اللّٰهَ	پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت
وَاَطِيْعُوْنِ	کرو۔

مبلّغ کے اتنے اہم اور بنیادی وصف سے یہ آیتِ دعوت جو تبلیغ کا ایک جامع پروگرام اپنے اندر رکھتی ہے، کیسے اغماض کر سکتی تھی؟ چنانچہ استغناء کی طرف بھی آیت میں لطیف اشارہ موجود ہے جو سمجھنے والوں کے لئے کفایت کرتا ہے اور وہ یہ کہ اس آیتِ دعوت میں دعوت الی اللہ کے تمام اصول و مقاصد بیان فرما کر اخیر میں اعلان فرمایا گیا کہ:-

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ — بے شبہ تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے گمراہ ہوگیا ہے اور وہی ہدایت پانے والوں کو بھی خوب جانتا ہے

اس سے واضح ہے کہ مبلغ کا فرض محض تبلیغ کی انجام دہی ہے اسے یہ فکر چھوڑ دینی چاہیئے کہ کون ہدایت پر آتا ہے اور کون نہیں۔ بلکہ کون اس کی تبلیغ پر کان دھرتا ہے کون نہیں۔ یا بالفاظ دیگر اسے نتیجۂ تبلیغ کا انتظار ہی نہ ہونا چاہیئے جس کے معنی یہ ہیں کہ مبلغ کو تبلیغ کے ثمرات سے بھی مستغنی رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ جس مبلغ کو کارِ تبلیغ میں اس درجہ منہمک رہنے کا امر ہے کہ خود اپنے منصبی کام کے نتائج کی فکر بھی چھوڑ دے اور اپنی مساعی کے معنوی ثمرات کا خطرہ بھی دل میں نہ لائے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اسی مبلغ کو کارِ تبلیغ کے کسی مادی ثمرہ کی فکر میں غلطاں و پیچاں چھوڑ دیا جاتا۔ پس تبلیغ کا ثمرۂ ہدایت جو مقاصدِ عالیہ میں داخل اور شرعاً مطلوب تھا جب اس سے بھی مبلغ کے قلب کو فارغ کر دیا گیا تو کسی غیر مطلوب اور وہ بھی خسیس ثمرہ (یعنی زر و مال) اور اس کی بھی حریصانہ طلب میں مبلغ کے قلب کو کیسے ملوث چھوڑا جا سکتا تھا؟

بہرحال آیتِ دعوت سے استغنا کا مطلوب ہونا قیاس بالاَوْلویت سے ثابت ہو جاتا ہے جیسے آیتِ کریمہ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ سے کپڑوں کی پاکی کے حکم سے بدن کی پاکی کا حکم بالاولویت ثابت کیا جاتا ہے۔

صبر و تحمل

ان تمام اوصاف و آداب کے بعد جو تبلیغ کا مقدمہ ہیں مبلغ کے لئے چند ایسے بنیادی اوصاف کی بھی ضرورت تھی جو دورانِ تبلیغ

ہیں اس کی تبلیغ کو عمل اور موثر بنا کر اس کی ذات میں جاذبیت پیدا کریں۔ اور ظاہر ہے کہ سلسلۂ دعوت و تبلیغ میں مخلوق کی اذیتیں جھیلنا اور ان کے معاملات میں ایثار سے کام لینا ہے یعنی صبر، حلم، ضبط اور تحمل وغیرہ جو سلسلۂ تبلیغ کی پختگی اور پائیداری کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دوران تبلیغ میں عموماً جاہلوں، ناعاقبت اندیشوں یا بد نیتوں کی طرف سے تلخیٔ حق کا جواب ایذا رسانی اور سخت کلامی سے دیا جاتا ہے اگر مبلغ میں صبر و ضبط نہ ہو تو اس کے لئے تبلیغ کا میدان کبھی ہموار نہیں ہو سکتا۔ کفار کی قولی ایذا رسانیوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تحمل کی ہدایت فرمائی گئی اور آپ نے صبر و ضبط کا عملی نمونہ قائم کر کے دکھا دیا،

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ	تمہارا امتحان تمہارے مالوں میں اور جانوں میں کیا جائے گا اور ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں اور جنہوں نے شرک کیا تھا سخت تکلیف دہ باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور ڈرو تو بے شبہ یہ اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

چنانچہ قولی ایذا رسانیوں سے آپ کو ساحر، مجنون، کذاب، کاہن، اشر وغیرہ سب ہی کچھ کہا گیا العیاذ باللہ لیکن آپ نے صبر و تحمل سے کام لے کر دعوت و ارشاد کا سلسلہ منقطع نہیں فرمایا۔

پھر اسی طرح عملی ایذا رسانیوں کی بھی اُدھر سے کمی نہیں ہوئی، کانٹے آپ کے راستہ میں بچھائے گئے، زہر آپ کو دیا گیا، سحر آپ پر کرایا گیا، طائف میں پتھر

آپؐ کے مارے گئے، کُتّے آپؐ کے پیچھے لگائے گئے، دندان مبارک آپؐ کا شہید کیا گیا، لڑائیاں آپؐ سے لڑی گئیں، گھر سے بے گھر آپؐ کو کیا گیا، بائیکاٹ آپؐ کا کرایا گیا لیکن آپؐ کے پائے استقلال میں کوئی ادنیٰ جنبش نہیں ہوئی اور فرض تبلیغ کے ادا کرنے میں کوئی ادنیٰ خلل نہیں آیا جس کی بنیاد قرآن حکیم کا یہ حکم تھا کہ:-

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ — آپؐ اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کیجئے اور ان کفار کے لئے جلدی نہ کیجئے۔

کہیں فرمایا گیا:-

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا — پس آپ صبر جمیل کیجئے

چنانچہ اس آیت دعوت میں صبر و تحمل کی ہدایت کسی اشارہ کنایہ سے نہیں بلکہ صریح الفاظ میں دی گئی کہ واصبر وما صبرك الا بالله

عفو و درگذر | پھر اس راستہ میں ایک صبر ہی درکار نہیں کہ مبلغ ان ایذا رسانیوں کا تحمل کر کے چپکا ہو رہے بلکہ اسے ایک قدم آگے بڑھ کر ان شرارتوں کو معاف بھی کر دینا چاہیئے کہ اسی سے مخاطب انجام کار ہموار ہو جائیں گے اور انھیں کے آثار سے اس کی شفقت پہچانی جائے گی۔ اسی لئے حضورؐ کو حکم دیا گیا تھا۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ — آپ اُن کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے استغفار کیجئے

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ — آپ ان سے اچھے طریقہ پر درگذر فرمائیے

پھر نہ صرف معاف کر دینے پر قناعت کا حکم ہوا بلکہ مبلغ کی خوبی یہ ہے کہ اُن بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی کرے اور احسان و حسنِ سلوک سے پیش آئے

جیسا کہ احادیث میں ان اخلاق کو اعلیٰ کیرکٹر کے سلسلہ میں شمار کرتے ہوئے اولوالعزمی کا نشان بتلایا گیا ہے ارشاد نبوی ہے۔

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَ	جو لوگ تم سے بدمعاملگی کریں تم ان کے ساتھ
اعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَ	بھی صلہ رحمی کا برتاؤ کرو، اپنے ظالموں کو
احْسِنْ إِلَىٰ مَنْ أَسَاءَ	معاف کرو اور جو تم سے بُرا سلوک کریں تم
إِلَيْكَ .	ان سے اچھا سلوک کرو۔

بہر حال مخاطبوں کی گستاخیوں کو جھیلنا بلکہ انھیں معاف کر دینا بلکہ اور اُلٹا ان پر احسان کرنا مبلغ کے خاص تبلیغی اخلاق ہونے چاہئیں کہ ان کے بغیر تبلیغ میں پائداری اور تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی لیکن ان خاص اوصاف کو چونکہ مبلغ کے ذاتی کیرکٹر اور منصبِ تبلیغ میں خاص دخل تھا اس لئے اس آیتِ دعوت نے اپنی صریح عبارت میں ان اوصاف کی طرف خصوصی توجہ دلائی اور فرمایا:۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا ۔	اور اگر تم سزا دو تو اتنی دو جتنی کہ تم کو دی
عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ	گئی ہے لیکن اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے
خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ	والوں کے لئے بہتر ہے۔

نیز فرمایا:۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا	اور آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر کرنا صرف
بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ	اللہ ہی کی وجہ سے ہوگا اور ان لوگوں کا
وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا	غم نہ کیجیے اور نہ تنگ دل ہو جیئے ان کی
يَمْكُرُونَ إِنَّ اللّٰهَ	چالاکیوں کی وجہ سے بے شبہ اللہ تعالیٰ

مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ

اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور اُن کے ساتھ جو محسن ہیں (یعنی اطاعت کے وقت اللہ کو حاضر و ناظر جانتے ہیں)

پس آیت کے اس آخری حصہ نے مبلغ کے ان اخلاق کے تمام اصولی مدارج واضح فرما دیئے جن کا تعلق مخاطبوں کی تربیت و تعلیم سے عملاً قائم ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مبلغ میں جذبۂ انتقام، جوش و غضب، شدت و غلظت، حملہ آوری، نبرد آزمائی، مقابلہ و معارضہ اور ٹکرا جانے سے بہتر یہی ہے کہ وہ مخاطبوں کی نالائقیوں کے باوجود اپنے حزن و ملال کو پی کر، ضیق اور کڑھن سے ہٹ کر اور ان کے مکر و فریب سے قطع نظر کر کے صبر و تحمل، عفو و درگذر، تقویٰ و طہارت اور احسان و سلوک کی راہ اختیار کرے اور اس کا خیال رکھے کہ ان اوصاف حمیدہ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے۔

داعی کے اضافی اوصاف

یہاں تک اس آیت سے ان اوصاف کے اثبات کی تقریریں کی گئی ہیں جو مبلغ کی ذاتی صلاح و رُشد سے متعلق تھے گویا فعل تبلیغ کی تاثیر اور پائیداری ان پر موقوف تھی کیونکہ ان کے بغیر مبلغ کا ذاتی کیریکٹر قائم نہ ہوتا تھا کہ وہ مسندِ تبلیغ پر آسکے۔

اب یہاں سے ان اوصاف و آداب پر غور کیجیے جن کا اولین تعلق فعل تبلیغ سے ہے گو وہ بھی مبلغ ہی کے اوصاف ہیں مگر عملی طور پر ان کا ایک سرا مدعو اور مخاطب

سے بھی جا ملتا ہے گویا پہلے اوصاف مبلّغ کے ذاتی تھے اور یہ اضافی ہیں، یا پہلے صلاحی تھے اور یہ اصلاحی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ سابقہ اوصاف کا تعلق مبلّغ کی ذات سے تھا اور ان ذیل کے اوصاف کا تعلق اس کی تعلیم و ہدایت سے ہے۔ پس مبلّغ کا پہلا اضافی وصف تعلیم وارشاد کے ساتھ (شانِ تربیت) ہونا چاہیئے جس کے ماتحت وہ اپنے مخاطبوں میں آہستہ آہستہ تدریجی رفتار سے ایک خاص رنگ پیدا کر کے انھیں حدِ کمال پر پہونچائے۔

شانِ تربیت

تربیت کے معنی کسی چیز کو رفتہ رفتہ اس کی حد کمال تک پہونچانے کے ہیں جیسے درخت کو ایک کونپل سے بتدریج تناور درخت بنا دینا، یا انسان کو آہستہ آہستہ پال پوس کر بچہ سے ایک بڑا انسان کر دینا تربیت اور ربوبیت کہلائے گا۔ پس جس طرح ماں باپ ایک بچہ کے جسم کو اسباب جسمیہ یعنی غذا کے ذریعہ بتدریج شباب کے کمال تک پہونچا دیتے ہیں اور اس پہونچے ہوئے کو بالغ کہدیا جاتا ہے اسی طرح ایک مبلّغ و داعی اور معلّمِ خیر انسان اپنے مخاطب کی روح اور روحانی قویٰ کو اسباب معنویہ یعنی علم و کمال کے ذریعہ بتدریج روحانی کمال تک پہونچانے میں اپنی ہمت صرف کرتا ہے اور جب وہ اس کمال پر پہونچا دے گا اسی کو واصل یا بالغ کہیں گے جیسے عارف رومیؒ نے کہا ہے ؎

خلق اطفال اند جز مردِ خدا
نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

پس اس شان تربیت کے ماتحت مبلغ کا فرض ہوگا کہ وہ اپنے مخاطبوں کو ان کے ذہنی ارتقاء کی حد تک علم الٰہی سے نشو و نما دیتا رہے اور جتنی جتنی ان کی ذہنیتیں مستعد ہوتی رہیں اسی حد تک حسبِ استعداد اپنی تعلیم کو بھی اونچا کرتا رہے۔

اس کا مقتضاء یہ ہے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی لائن پر اول چھوٹے چھوٹے اور آسان مسائل سے تربیت شروع کرے جنھیں مخاطبوں کا ابتدائی ذوق قبول

کر سکے اور بعد میں جہات مسائل اور اصول وکلیات پر لائے اگر وہ اس وطیرہ طبعی پر چلے گا تو شرعی زبان میں اس کا لقب ربّانی ہوگا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، نے ربّانی کی تفسیر یہی کی ہے کہ وہ اپنے مستفیدوں کو بتدریج چھوٹے مسائل پر لگا کر بڑے مسائل تک لائے نہ یہ کہ ابتداءً ہی اونچے اونچے مضامین بیان کر کے مخاطبوں کو بلا زینہ بامِ رفیع پر گدا دینے کی سعی کرنے لگے۔ ابن عباس رضہ ربّانی کے بارہ میں فرماتے ہیں:۔

الَّذِیْ یُرَبِّی النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ ثُمَّ بِکِبَارِہَا۔ (بخاری)

جو لوگوں کی تربیت پہلے چھوٹے علم (جزوی اور علمی مسائل) سے کرے اور پھر بڑے علم (یعنی جہات مسائل) سے

اس آیتِ دعوت میں مبلّغوں کی اس شانِ تربیت کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں اسلام کو سبیلِ رب ؑ سے تعبیر فرما کر اس سبیل کو اللہ کی صفتِ ربوبیت کی طرف منسوب فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تدریجاً کمال تک پہونچانے والے کے راستہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور یہ اصول اہلِ عقل اور اہلِ بلاغت دونوں کا مسلّمہ ہے کہ اس قسم کے مواقع پر اضافتوں میں مرکب اضافی کے آخر کلمہ کا وصف اول کلمہ میں باور کرانا ملحوظِ خاطر ہوتا ہے مثلاً کسی غضبناک کو جو غیظ وغضب میں بھڑک رہا ہو یوں تنبیہ کی جائے کہ اے بندہ رحمٰن کیا کر رہا ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رحمت والے کا بندہ ہو کر یہ غیظ وغضب؟ تجھے تو رحمت کا پیکر ہونا چاہیئے تھا۔ یا کسی شخص کو جہالت کی حرکات کرتے دیکھ کر کہا جائے کہ اے عالم کے بیٹے کیا کرتا ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تجھے تو

علم سے نسبت تھی پھر یہ جہالت کیسی؟ اگر نسبت و اضافت سے یہ فائدہ حاصل نہ ہو تو یہ مرکب اضافی محض لغو اور فضول ہو جائے جس سے بُلغا کا کلام بری ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب مبلغوں اور داعیانِ دین کو خطاب کیا گیا کہ ربوبیت والے کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس راہ میں ربوبیت و تربیت کی شان پیدا کر دیعنی آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ ان کے قلوب وارواح کو حدِ کمال تک پہونچاؤ۔

ظاہر ہے کہ اگر سبیل کی اضافت رب کی طرف ہونے کے باوجود دعوتِ سبیل میں یہ وصفِ تربیت ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہ اضافہ محض لغو اور بے فائدہ ہو جائے گا حالانکہ ایسی لغویت سے تو معمولی متکلموں کا کلام بھی بری ہوتا ہے چہ جائیکہ رب العٰلمین کا کلام اعجاز النظام اپس اس آیت کی رو سے داعئ دین کے لئے محض پیام رسانی کافی نہیں ہو سکتی بلکہ اُسے اپنے مخاطبوں کے حق میں مربی اور مشفق ہونا چاہیئے جس سے بتدریج وہ روحانی نشو و نما پائیں اور ایک خاص رنگ سے رنگے جائیں۔

تدریج و تیسیر پھر تربیت کے معنی ہی چونکہ کسی چیز کو آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ حدِ کمال پر پہونچانے کے ہیں اس لئے تربیت کے ماتحت سب سے پہلا مقام تدریج و تیسیر ہے کہ طالبانِ حق کو رفتہ رفتہ مطلوبہ نقطہ تک پہونچایا جائے جس میں مخاطبوں کی سہولت اور ان کی رفتارِ قبولیت کی رعایت بھی پیشِ نظر ہو۔

تجزیۂ پروگرام جس کی پہلی صورت پروگرام کا تجزیہ ہے یعنی مکمل پروگرام

کے حصے اور اجزا، الگ الگ کر کے تبلیغ میں وہ اجزا، مقدم کیئے جائیں جن کا ماننا مخاطب پر زیادہ شاق نہ ہو اور وہ کسی حد تک اس حصہ سے مانوس ہو۔ کیونکہ اگر سارے احکام کی نامانوس اور بوجھل گٹھڑی ایک دم اس پر لاد دی جائے تو اول وہلہ ہی میں اس سے وحشت زدہ ہو کر پورا بوجھ اپنے سر سے ایک دم اتار پھینکے گا اور تبلیغ رائگاں چلی جائے گی۔

مثلاً حضورؐ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو جب یمن کا گورنر اور قاضی بنا کر بھیجا تو تبلیغی سلسلہ میں اسی تجزیہ پروگرام اور ترتیب طبعی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں وہاں نصاریٰ کی قوم ملے گی انھیں دین کی دعوت اس طرح دینا کہ اول ان کے سامنے کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پیش کرنا، جب وہ اسے قبول کرلیں تو پھر کہنا کہ نماز کا بھی ایک فریضہ تم پر عائد ہوتا ہے، جب اسے بھی مان لیں تو کہنا کہ تمہارے مالوں میں تم پر زکوٰۃ کا بھی ایک فریضہ آتا ہے جب وہ اسے بھی تسلیم کرلیں تو پھر روزہ کی تلقین کرنا وعلیٰ ہذا القیاس۔

تجزیۂ پروگرام کا یہ مرتبانہ اسلوب اس لئے اختیار کیا گیا کہ غیر مانوس طبیعتیں ابتداءً غیر مذہب کے سارے پروگرام سے نہ مانوس ہو سکتی ہیں اور نہ اعتقاداً اور عملاً اس کا تحمل ہی کر سکتی ہیں بلکہ بتدریج ہی ان میں استعداد قبول پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ان کی ابتدائی ناقص استعداد اور ناتمام اُنس کی حالت میں انتہائی احکام تک کا مکمل بوجھ ان پر ڈال دیا جائے تو وہ اچٹ کر سرے سے سارے ہی پروگرام سے بیزار ہو جائیں گے اور اس طرح ہدایت سے ہمیشہ کے لئے محروم رہیں گے

قرآن کریم نے اہل کتاب کو تبلیغی خطاب کرتے ہوئے اسی تدریج و تیسیر کی تائید

کی اور اسلامی پروگرام میں اعتقادات کی اور ان میں سے بھی توحید عبادت کو یہ کہکر مقدم رکھا کہ اس اعتقاد پر آجانا اہل کتاب پر بھاری نہیں ہے جبکہ وہ پہلے سے بھی اس دعویٰ توحید سے گریز کیے ہوئے نہیں ہیں۔ فرمایا:۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ	آپ فرما دیجیے کہ اے اہل کتاب تم اس کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے اور وہ یہ کہ ہم سوائے خدا کے کسی اور کی عبادت نہ کریں گے اور نہ کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک کریں گے اور نہ خدا کے سوا ہم میں سے کوئی کسی کو رب بنائیگا

بہرحال شانِ تربیت کے تقاضے کے ماتحت تجزیۂ پروگرام ایک امرِ طبعی ہے جس کے بغیر تبلیغ کارگر نہیں ہو سکتی۔

تجزیۂ مسائل

بلکہ اسی شانِ تربیت کے ماتحت محض تجزیۂ پروگرام ہی نہیں بلکہ گاہ گاہ تجزیۂ مسائل کی بھی نوبت آجاتی ہے یعنی ایک ہی مسئلہ کی تحلیل کر کے اس کے چند حصے کرلئے جائیں اور ایک ایک حصہ کی تبلیغ حسبِ استعدادِ مخاطب بتدریج کی جائے۔

چنانچہ حق تعالیٰ نے اہلِ عرب کو جب شراب سے روکنا چاہا جو اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی تو ایک دم شراب کو حرام نہیں فرمایا بلکہ پہلے حکم میں شراب کی کچھ بُرائی بیان کی گئی اور وہ بھی لوگوں کے سوال کرنے پر کہ:۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ — (اے پیغمبر) لوگ آپ سے سوال کرتے

وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا

ہیں شراب اور جوئے کے بارہ میں آپ فرما دیجئے کہ ان میں بڑی برائی ہے اور نفع بھی ہے مگر ان کی برائی نفع سے زیادہ ہے

اور جب اس سے لوگوں میں شراب کو برا سمجھ کر اس سے بچنے کی فی الجملہ استعداد ہو چلی تو ایک قدم آگے بڑھکر نماز کے اوقات میں شراب سے روکا گیا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

اے ایمان والو! تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم اسے جانو جسے تم کہو۔

اور جب اس حکم ثانی سے وہ عملاً شراب سے رکنے پر قادر ہونے لگے تو پھر دوسرا قدم اور آگے بڑھا کر صفائی سے شراب کی حرمت اور نجاست عین ہونے کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا کہ:۔

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ

(شراب) ناپاک ہے اور شیطان کا عمل ہے تم اس سے بچو۔

اس کے بعد دلوں میں سے شراب کی محبت جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ان برتنوں کا استعمال بھی ممنوع فرما دیا گیا جو شراب کے لئے جام و سبو کا حکم رکھتے تھے یعنی حَنْتَمْ (کوزہ سبز)۔ دُبَّا (خشک کدو اندر سے کھوکھلا)۔ نَقِیْر (کاویدہ چوب جام)، مُزَفَّتْ (روغنی پیالہ) وغیرہ جیسا کہ حدیث نبوی میں اس کی تفصیل فرمائی گئی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اگر کوئی برائی قدیم سے کسی قوم میں رچی ہوئی ہو تو اس کے استیصال کی صورت ہی یہ ہے کہ اس ایک برائی کے چند اہم اجزاء الگ الگ نکال کر

تدریجی ممانعت کی جائے کہ ایسی صورتوں میں تدریج و تیسیر ہی ایک فطری روش ہے جو مخاطب کو آہستہ آہستہ مسئلہ کی آخری حد تک کھینچکر لا سکتی ہے۔ نماز کی وہ مہذب صورت جو نکھر کر آج اُمت کے زیر عمل ہے کتنی تدریجی رفتار سے یہاں تک پہونچی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابتداءً نماز میں سلام و کلام، بات چیت، دیکھنا سننا، گردن اور رُخ پھیرنا، اِدھر اُدھر منہ موڑنا حتیٰ کہ چلنا پھرنا اور درمیان میں چھوٹا موٹا کام کاج کر لینا سب ہی کچھ جائز تھا اور اس کی مکمل موجودہ صورت قائم نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی کہ لوگوں میں ابتداءً اتنی مکمل شائستگی اور رموز و نیت ہی نہ تھی اس لئے نماز کی ہیئت میں آہستہ آہستہ یہ تمام تہذیبیں قائم کی گئیں کسی وقت دیکھنا اور منہ اِدھر اُدھر کرنا ممنوع ہوا کسی وقت سلام و کلام کی ممانعت آ گئی کسی وقت چلنے پھرنے کی ممانعت ہوئی کسی وقت خشوع و خضوع اور سکونِ قلب و نظر ضروری ٹھہرایا گیا۔ گویا اس کے حصے حصے کر کے بتدریج اس میں شائستگی پیدا کی گئی جس کا حاصل وہی تربیت نکل آیا جبکہ تربیت کے معنی بھی درجہ بدرجہ کسی شے کو حدِ کمال پر پہونچانے کے ہیں۔ اور جبکہ تربیت کے مفہوم ہی میں تدریج اور درجہ بدرجہ آگے بڑھنا داخل ہے جس کا حاصل تجزیۂ مقاصد اور ان کے پہونچانے میں تدریج ہے خواہ یہ تجزیۂ مقاصد تجزیۂ احکام کی صورت میں ہو یا تجزیۂ مسائل کی شکل سے ہو دونوں تجزیئے یقیناً تربیت کے عموم میں داخل ہیں اور دعوت و تبلیغ میں یہ تربیت از روئے قرآن مقصود ہے جیسا کہ ابھی ثابت ہوا۔ تو یہ تجزیۂ مقاصد بھی اس تربیت کا جزو بن کر قرآن حکیم کی اس آیت سے ثابت شدہ مانا جائے گا۔

نیز جبکہ صبر و تحمل بھی اسی آیتِ دعوت کی رو سے مبلغ کے حق میں ضروری ہے

جس کا اس آیت میں صریح امر کیا گیا ہے اور اس سے جلد بازی اور عجلت پسندی کی ممانعت نکلتی ہے جس کا حاصل اس کے سوا اور دوسرا نہیں کہ مخاطبوں کی اڑی کڑی جھیل کر جلد بازی اور عجلت پسندی سے بچاؤ اختیار کیا جائے اور رفتہ رفتہ قوم کے راہِ حق پر آجانے کا انتظار کیا جائے۔ تو یہ ہی وہ تدریج اور اصلاح میں درجہ بدرجہ آگے بڑھنا ہے اس لئے دعوتِ تدریج کا یہ ایک دوسرا ثبوت بھی ہے جو اسی آیتِ دعوت سے نکل آتا ہے۔

ثبات واستقلال اور جبکہ شانِ تربیت کے ماتحت کسی کام کو آہستہ آہستہ چلانے اور بتدریج آگے بڑھانے میں کافی انتظار کی زحمت اُٹھانی پڑتی ہے بالخصوص جبکہ راہِ تربیت میں لوگوں کو ان کے خلافِ طبع آمادہ کرنے کے سبب قدم قدم پر مخاطبوں کی طرف سے مخالفت اور ایذا رسانی کے واقعات پیش آتے ہوں اور ایسی حالت میں انسان کی کمزوریوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ہمت ہار کر میدان چھوڑ بھاگے تو ایسے ہی اوقات میں پختگی اور استقلال سے ان کمزوریوں کا تدارک ہو سکتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ایسے تدریجی امور میں جلد بازی، عجلت پسندی اور تلوّن مزاجی سمِ قاتل ثابت ہوتی ہے۔ یہاں اگر کوئی چیز نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے تو وہ صرف تمکّن واستقلال اور عزم وثبات ہے کہ اس کے بغیر تربیت اور نتائجِ تربیت کا ظہور عادۃً ناممکن ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عکاظ ونجنہ کے بازاروں کے مواقع پر تبلیغ کے لئے تشریف لے جاتے یا حج کے موقع پر لوگوں کو پیغامِ الٰہی پہونچاتے اور کفارِ مکہ آپ کی راہ میں روڑہ بن کر اٹکتے، توہین کی سعی کرتے اور ایذائیں پہونچاتے

تو آپؐ کے پائے استقلال میں ان رکاوٹوں سے کوئی ادنیٰ فرق نہ آتا کہ یہی شانِ تربیت کی اساس ہے اور تربیت اس آیت کی دلالت میں موجود ہے تو یہ پختگی اور مستقل مزاجی بھی اسی دلالت کے تحت ہو کر اسی آیت سے ثابت ہو جاتی ہے۔

معیت وملازمت

اور جبکہ تربیت کے لئے عجلت پسندی یا تلوّن سمِّ قاتل ثابت ہوا اور تمکن و استقلال ضروری ٹھہرا جس کے لیے لامحالہ طویل وقفہ اور وقت کی ضرورت ہے تو اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مبلّغ مخاطبوں کو اپنے ساتھ زمانۂ طویل تک وابستہ اور کثیر الملازمت رکھے تاکہ ان میں تبلیغ و تربیت سے کوئی خاص رنگ قائم ہو جائے جسے شرعی اصطلاح میں صحبت و معیت کہتے ہیں۔ چنانچہ دینی رنگ کی اساس یہی صحبت و معیت ہے جس کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام اپنے وابستوں کو تربیت دے کر حدِ کمال تک پہنچاتے ہیں اور اسی لئے ان کے بلاواسطہ مستفیدوں کو صحابہ یا اصحاب یا حواری کہا گیا ہے جس کا مادہ یہی صحبت ہے اور جن میں بواسطۂ صحبت آثارِ نبوت سب سے زیادہ راسخ ہوتے ہیں اسی لئے حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ جو اصحاب آپ کے زیرِ تربیت ہیں اور بالخصوص فقراءِ مسلمین آپ اُن کو صبح و شام اپنی صحبت میں رکھئے اور اُن میں رہیئے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ	اور آپ اپنے آپ کو اُن لوگوں کے ساتھ
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ	رکھئے جو صبح و شام اپنے رب کو بلاتے
وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ	ہیں اور اس کا ارادہ کرتے ہیں اور آپ
وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ	اپنی آنکھیں ان سے نہ ہٹائیے اس

تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ	حال یں آپ دنیوی زندگی کی زینت کے
الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ	خواہاں ہوں اور آپ ان لوگوں کی اطاعت
اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ	نہ کیجئے جن کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے
ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ	غافل کردیا ہے اور جو اپنی خواہشات کا
وَكَانَ اَمْرُهٗ	اتباع کرتے ہیں اور جن کا معاملہ زیادتی
فُرُطًا	کا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تدریج وتیسیر اور تسلسل کے ساتھ داعی کا مخاطبوں سے تخاطب کرتے رہنا اور اُن پر مسلسل اثر ڈالنے کی سعی میں لگا رہنا تربیت کے لوازم میں سے ہے ورنہ تربیت کے آثار نمایاں نہیں ہو سکتے بلکہ خود تربیت ہی اپنے ان لوازم کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتی تو اسی کا اصطلاحی نام معیت وصحبت ہے۔ اس لئے تربیت کی راہ سے اس کے یہ لوازمِ صحبت ومعیت بھی اسی آیت سے ثابت شدہ ماننے جائیں گے کیونکہ :-

اَلشَّئُ اِذَا ثَبَتَ ثَبَتَ	شئے جب ثابت ہوتی ہے تو اپنے
بِلَوَازِمِهٖ	لوازم سمیت ہی ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے جب تربیت اس آیت سے ثابت شدہ ہے تو اس کے یہ لوازمِ صحبت ومعیت بھی اسی آیت سے ثابت شدہ سمجھے جائیں گے خواہ بطور اقتضاء ہی کے ثابت ہوں

بہرحال داعی الی اللہ کے اوصاف کے سلسلے میں بنیادی طور پر یہ تمام اساسی مقام ثابت ہوگئے جن میں سے بعض مبلغ کی ذات کے

لئے ضروری ہیں اور بعض اس کے فعل تبلیغ کے لئے۔ جن کے بغیر ایک
مبلغ کی تبلیغ کبھی تام اور نتیجہ خیز .... نہیں ہو سکتی۔

خلاصۂ مباحث

الحاصل دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں یہ آیت کریمہ (آیت دعوت) ایک مکمل پروگرام اور بنیادی دستور العمل ہے جس سے نظام دعوت کے بہتر مقامات ثابت ہوتے ہیں کچھ اس نص کی عبارت سے، کچھ دلالت سے، کچھ اشارات سے اور کچھ اقتضاء سے اور کچھ قیاس بالأولویت وغیرہ سے جن کا خلاصہ بلالحاظ ترتیب حسب ذیل ہے۔

اولاً نظام دعوت کے چار رکن دعوت۔ داعی۔ مدعو۔ مدعو الیہ۔ پھر ان چار حقیقتوں کے چار مصداق۔ دعوت کا مصداق فعل تبلیغ جو مبلغ سے صادر ہو داعی کا مصداق اولاً ذات نبوی اور پھر تمام وارثان نبوت۔ مدعو کا مصداق پورا عالم بشریت تا قیام قیامت۔ مدعو الیہ کا مصداق سبیل رب یعنی پوری شریعت ان چار گانہ ارکان میں سے رکن اول یعنی دعوت کی چھ نوعیتیں۔ دعوت قولی دعوت عملی۔ حکمت قولی۔ حکمت عملی۔ مجادلت قولی۔ مجادلت عملی۔

پھر فعل دعوت کی چار بنیادی صفات۔ فصاحت کلام۔ تنوع مضامین دعوت تعدد اسالیب بیان۔ تجدد دعوت

پھر وسائل دعوت کے سلسلہ میں تبلیغی نقل و حرکت اور چھ قسم کے سفر تعلیمی سفر

اخلاقی سفر، عبادالی سفر، جہادی سفر، تجارتی سفر، تبلیغی سفر جن کے راستہ سے تبلیغ میں عموم پیدا ہوتا ہے۔ پھر دعوت کی عملی ترتیب کے سلسلہ میں ترتیب وار پانچ محل توجہ نفس، اہل وعیال، اقربا، اہل شہر و مضافات اقالیم وممالک دنیا۔

رکن ثانی یعنی داعی کے ذاتی اوصاف کے سلسلے کے دس اوصاف علم و بصیرت، فہم و فراست، دانش و خلق، سیرت و کردار، خوف و خشیت غنا و استغنا، صبر و تحمل، عفو و درگذر، رحمت و رافت، اغماض و مسامحت

پھر داعی کے اضافی اوصاف کے سلسلہ کے تیرہ مقامات۔ شان تربیت، تدریج و تیسیر، ترک غلظت و شدت، تمکین و ثبات، عزم و استقلال، رعایت طبائع۔ تجزیۂ پروگرام، تجزیہ مسائل، طول صحبت و معیت، انتخاب و فیصلہ، طرز خطاب تنظیم و مرکزیت، فراہمی شوکت و قوت، رکن ثالث یعنی مدعو کے سلسلہ میں مخاطبوں کی تین قسمیں اذکیار، اغبیار، صلحار

پھر تاثر و انفعال کی رو سے مدعو کے پانچ اوصاف حسن استماع، سمع قبول، سوء سماع کی چار بنیادی صورتیں لہو قلب، اعراض و گریز، شغب و اضمحلال، استہزار دعوت، رکن رابع مدعو الیہ یعنی دعوتی پروگرام کے چار منفی مقامات جو موضوع دعوت سے خارج ہوں گے طبعیات، عقلیات، حسیات، مخترعات۔

اور نو مثبت مقامات جو اصل موضوع تبلیغ ہیں۔ تشریعیت، سذاجت (سادگی و بے تکلفی)، جامعیت، اجتماعیت، عالمیت (بین الاقوامیت، بین الاوطانیت بین النسلیت، بین اللونیت)

یہ تمام عرض کردہ مباحث جو تبلیغ کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کتاب وسنت کے مختلف مواقع پر صریح عبارات سے بھی ثابت ہیں لیکن جبکہ احقر کے فکر نارسا کے مطابق یہ جامع آیت ان سارے مقامات کو کسی نہ کسی طرح اپنے نظم میں لئے ہوئے تھی اس لئے اسی آیت کو اس رسالہ کا سرنامہ بناکر ان مقاصد کا اس سے استنباط پیش کیا گیا تاکہ تبلیغی مہمات کا یہ مختصر مگر جامع پرگرام ایک ہی آیت سے ہمہ وقت بآسانی سامنے رہ سکے۔

اگر ان اصولوں پر صحیح معنی میں منظم تبلیغ شروع ہو جائے تو مسلمانوں کے تمام وہ دینی و دنیوی اور مذہبی و سیاسی مقاصد بے تکلف حاصل ہو سکتے ہیں جن کے لئے پلیٹ فارموں پر جد و جہد بہت کچھ جاری ہے مگر نتائج سے ہمکناری میسر نہیں آرہی ہے۔

قرنِ اوّل کے فاتحانہ اقدامات میں دعوتِ اسلامی

قرنِ اول کی مقدس جماعتیں جس ملک میں بھی فاتحانہ اقدامات کے ساتھ پہونچیں انھوں نے تبلیغ اسلام کو ہمیشہ آگے رکھا اور ملک میں دین کو برپا کیا کہ ان کے نزدیک فتوحات ممالک کا منتہائے مقصود اشاعت اسلام اور تعلیم و تبلیغ دین حق ہی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ جس ملک کو بھی فتح کرتے اس میں تبلیغ حق کی بدولت اسلامی نظام کے لئے فضا خود بخود ہموار ہوتی چلی جاتی تھی اور اسلامی دولت کے ساتھ اسلامی نظم بھی عام رعایا میں طبعی طور پر خود ہی قائم ہو جاتا تھا اور اس طرح یہ حضرات ممالک واقالیم ہی کے نہیں دلوں اور روحوں حتی کہ عام تہذیبوں اور کلچروں کے

بھی فاتح ہو جاتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ دنیا کی زمینوں میں تو کاشت ان کی ہو اور خود ان کے دلوں کی زمینوں میں تخم ریزی وہاں کے رسم و رواج کی ہوتی رہے اور وہ نہ بدلیں بلکہ وہ اس تبلیغ اور پھر عملی تبلیغ کی بدولت اسلامی اصول کی تخم ریزی بھی عامۃً قاوب میں کر کے وہاں کی زمین و آسمان کو بدل ڈالتے تھے۔

اس فتح عام کا یہ ثمرہ نکلتا تھا کہ مفتوحہ ممالک کا نظام سیاسی بھی خود بخود اسلامی سانچوں میں ڈھلتا چلا جاتا تھا اور وہ سلطنت محض مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی ہو جاتی تھی یعنی سلطنت کے بجائے خلافت کی جڑیں مضبوط ہو جاتی تھیں، قانون الٰہی کی عظمت و سطوت عام رعایا کے قلوب پر حکمراں ہو جاتی تھی بندوں کی بندوں پر نہیں بلکہ بندوں پر خدا کی حکومت کا نقش جم جاتا تھا جس سے کوئی بندہ اپنے کو بندہ جانتے ہوئے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے تمام مفتوحہ علاقے خلافت سے وابستہ ہو جاتے تھے اور ان خلفاء الٰہی کا دم بھرنے لگتے تھے، اخلاق فاضلہ کا دور دورہ ہو جاتا تھا۔ دلوں میں قومی یا وطنی عصبیت کے بجائے ہمہ گیر اخوت اور خلوص باہمی کے جذبات ابھر آتے تھے جن کے ثمرات امن عام اور سکون تام کی صورت میں نمایاں ہوتے تھے۔ خود غرضیوں اور عیاریوں کے لئے جگہ نہیں رہتی تھی، بد دیانتی اور کم حوصلگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگتا تھا، صلح اور جنگ، ملنا اور قطع ہونا سب اصول فطرت کے مطابق ہو جاتا تھا، غرض اسلامی اخلاق و اعمال کے ہمہ گیر بن جانے کے لئے اس تبلیغ کی بدولت فضا ہموار ہو جاتی تھی اور دلوں میں اسلامیت کی تخم ریزی سے فتنے خود بخود سست پڑ جاتے تھے۔

قیامِ حکومتِ الٰہیہ سے پہلے

دعوت وتبلیغ کی ضرورت

اسلامی قانون اور شرعی سیاست اپنی ذات سے معقول و دلپذیر، امن خیز اور مظالم شکن سہی لیکن اس کے لئے اسی کے مناسب فضاء اور ماحول کی بھی تو ضرورت ہے جو اسے دلچسپ اور دلپذیر بنائے اور وہ ماحول بغیر اس حقانی تبلیغ اور دعوت وارشاد کے پیدا نہیں ہوسکتا جو عرض کردہ قرآنی اصول پر مبنی ہو اس لئے اسلامی فضاء پیدا کرنے والے اس نظام تبلیغ کو چھوڑ کر اسلامی دیانت اور اسلامی سیاست دونوں کے لئے زمین ہموار کرلینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اگر بغیر اس ارشادی نظام کے اسلامی نظام کا کوئی ڈھچر قائم بھی کرلیا جائے تو وہ محض اسمی ورسمی ہوگا جس میں نہ کوئی جذب وکشش ہوگی نہ پائیداری وپختگی۔ اور اگر کسی حد تک ہوئی بھی تو پھر اس سے دین کے نام پر لادینی کی فضاء ہموار ہوتی رہے گی جو انجام کار خود اسلامی مقاصد کے لئے مخرب ثابت ہوگی۔ اس لئے دیانت ہی کے حق میں نہیں سیاستِ اسلامی کے حق میں بھی یہ تبلیغ وارشاد ایک روحِ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔

آج امت کا سب سے شدید مرض اور عظیم فتنہ یہی ترکِ تبلیغ اور ترکِ امر بالمعروف ہے جس نے اس کے ہر ایک نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے جب کسی خاطی اور مجرم کو اپنے جرم و خطا پر مطلع ہونے کی صورت ہی نہ رہے اور کسی کی طرف سے کسی کو روک ٹوک کرنے کا راستہ ہی کھلا ہوا نہ ہو۔ گویا مریض کو نہ خود اپنے مرض کی خبر ہو نہ دوسرے کی طرف سے تنبیہ کی صورت ہو تو ظاہر ہے کہ پھر ازالہ مرض کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے اور قوم کس طرح پنپ سکتی ہے۔

ہر ملک میں علماء کرام اپنی بساط کے موافق ادھر توجہ فرما رہے ہیں اور انہی کی توجہ سے اس دورِ فتن میں اسلام کی باغ و بہار قائم ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ مسلم ممالک اجتماعی انداز سے اس فریضہ کو اسی طرح اپنے ہاتھ میں لیں جس طرح قرنِ اول کی حکومتوں نے اس کا نقش قائم کیا۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس سلسلہ میں خصوصیت سے مصر و حجاز کا تذکرہ نہ کیا جائے مصر نے اپنے نقطۂ خیال کی حد تک اسلامی تعلیمات کو عام کرنے میں بلاشبہ ایک کردار ادا کیا ہے۔ افریقی ممالک میں جامعہ ازہر کے فضلاء نے اسلام کی اشاعت میں تندہی اور جانفشانی دکھلائی اور اس عظیم مقصد کے لئے مالی قربانیاں دی ہیں۔ افریقہ کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی خواہ وہ اسلامی ہوں یا غیر اسلامی لاکھوں روپے کے اخراجات سے بعثتیں بھیجیں جنہوں نے مصر سے ان ممالک کے علمی رابطے قائم کر دیئے اور علمی حد تک اسلامی رشتوں کو ہمہ گیر اور مضبوط بنانے میں قابلِ تقلید مثال پیش کی ہے۔ حجاز نے بھی ملکی حد تک اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کی طرف قدم اٹھایا ہے خدا کرے کہ وہ اپنی دینی مرکزیت کے شایانِ شان

اسلامی تبلیغ کی طرف مزید اقدامات کا سلسلہ شروع کرے جبکہ حقیقی معنی میں وہی مرکز تبلیغ دین ہو سکتا ہے کیونکہ وہی مرکزِ دین مہبطِ وحیٔ الٰہی اور مخزن ختم نبوت ہے اس لئے اسی کو مرکزِ دعوتِ عام بھی ہونا چاہیئے۔

حجاز نے الرابطۃ الاسلامیہ قائم کر کے اس طرف ایک مبارک اقدام کیا ہے اسے تبلیغی حیثیت سے اور زیادہ وسیع اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح اور بھی مسلم ممالک میں یہ تصورات سامنے آچکے ہیں اور امکانی حد تک مسلم حکومتیں اس طرف بڑھ رہی ہیں۔ قرآن حکیم نے اسلامی حکومت کی غرض و غایت ہی اقامتِ دین اور نظام امر بالمعروف و نہی عن المنکر قرار دیا ہے اس لئے مسلم ممالک جہاں اپنے اپنے وطن کی خدمت تمدنی حیثیت سے کر رہے ہیں اور ان کی یہ سعی مشکور ہے، وہیں ملک کی خدمت اسلامی حیثیت سے بھی ضروری ہے جس کا ذریعہ تعلیم و تبلیغ ہی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں جو قدم اُٹھ چکے ہیں وہ مبارک ہیں لیکن یہ میدان ابھی اور وسیع ہے اور اس میں مزید تیز رَو قدم اُٹھنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم و تبلیغ کے آداب و شروط کتاب و سنت میں تفصیل سے موجود ہیں جو زیب بعنوان آیتِ دعوت کی روشنی میں مختصر انداز سے اس مختصر رسالہ میں گذارش کر دیئے گئے ہیں۔

دستور العمل

اگر اسلامی مبلغ آیت دعوت کے پیش کردہ اصول دعوت اسلام پر حسب ذیل تدابیر کے ماتحت کاربند ہوں تو امید ہے کہ ان کی تبلیغ پختہ اور دور رس اثرات پیدا کرسکے گی۔ اصولِ مذکورہ کی روشنی میں حسب ذیل پروگرام یہ ہونا چاہیئے۔

(۱) دعوت الی اللہ کے جذبہ کے مخلص افراد یکجا ہو کر اولاً اس بارہ میں کسی کو اپنا مرکز بنالیں (جہاں مسلم حکومتیں ہیں وہ قدرتی مراکز بنے بنائے ہیں جن کی ہدایت پر وہ گامزن ہوں اور یہ مراکز اس سلسلہ میں چند مخلص اہل علم و فضل اور چند ذی رائے اور معتبر افراد سے استشارہ و مشورہ کا ربط قائم کر کے ہدایات جاری کرتے رہیں۔

(۲) جوں جوں کام وسیع ہوتا جائے اسی حد تک مختلف مواقع میں مرکز کے تحت دوسرے تبلیغی مراکز قائم کئے جائیں جہاں سے مبلغین اٹھ کر اطراف میں دورے کریں اور ان مراکز کو اپنے مستقر (ہیڈ کوارٹر) کی حیثیت سے استعمال کریں جن کا رجوع مرکز المراکز کی طرف ہو جو منظور شدہ ہدایات و قوانین کے ماتحت مراکز کو آگاہ کرتا رہے اور ساتھ ہی مبلغین کی خدمات کا جائزہ بھی لیتا رہے،

(۳) اس دعوت کے مدعو غیر مسلم ہونے چاہئیں جن کے سامنے دین رکھا جائے

داخلی اصلاح وتذکیر کے لئے دوسری جماعتیں ہوں جو مسلمانوں کی اصلاح وارشاد کو اپنا نصب العین بنائیں۔

(۴) ان حضرات کے پاس ایک مختصر سا کتب خانہ اور دارالمطالعہ ہونا چاہئے جس میں اسلامی تبلیغ کے بنیادی لٹریچر کے ساتھ اُن مذاہب کی کتابیں خصوصیت سے جمع کی جائیں جو ان ممالک میں رائج ہیں بالخصوص ہندوستان میں جیسے آریہ، سناتنی، پارسی، بدھسٹ، عیسائی اور یہودی وغیرہ۔ اور مبلغین ان اقوام کی نفسیات اور مذہبی اصول و فروع کو زیر نظر رکھکر اپنے تبلیغی کلام اور دعوت کا آغاز کریں اور خصوصیت سے وہ شکوک و شبہات اور ان کے جوابات ملحوظِ خاطر رکھیں جو ملک کی اقوام ازراہِ تعصب اسلام پر کرتی رہتی ہیں۔

(۵) آج چونکہ انفرادیت کا دور ختم ہوکر اجتماعیت کا رنگ غالب آتا چلا جارہا ہے اور ہر کام جماعتی رنگ ہی میں پیش ہوکر مؤثر بھی ہوتا ہے اس لئے ان مراکز سے تبلیغی دورے جماعتی طور پر ہونے چاہئیں۔ جماعتیں مل کر اہلِ علم کی قیادت میں نکلیں پروپیگنڈہ اور تشہیر سے گریز کرکے دعوت الی اللہ کی صورت اختیار کریں جیساکہ سابقہ اوراق میں اس کا شرعی ثبوت پیش کیا جاچکا ہے۔

(۶) ان جماعتوں میں کچھ ایسے با اثر افراد اور با اقتدار شخصیتیں شامل کرنے کی بھی پوری سعی کی جائے جو اپنے منصب یا عہدہ یا حیثیت عرفی کے لحاظ سے قلوب میں با عظمت ہوں کہ اس سے تبلیغ کے اثرات جلد سے جلد بھی نمایاں ہوں گے۔ مؤثر اور پائیدار بھی ثابت ہوں گے اور ساتھ ہی ان میں ایک وسعت اور ہمہ گیری بھی پیدا ہوجائے گی۔

(۷) جس مقام پر مبلغین کی یہ جماعت پہونچے آغازِ تبلیغ سے اس کی سعی ہونی چاہیئے کہ وہ اولاً مقامی، بااثر اور سربرآوردہ لوگوں سے مل کر ان کو اپنا ہم خیال بنائے اور پھر انھیں کے زیرِ سایہ و مشورہ تبلیغ کا آغاز کیا جائے۔

(۸) جو لوگ کلمۂ حق کو قبول کرلیں مرکز سے ان کے لئے ابتدائی بنیادی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیئے جس کا خاص نصاب ہو۔ اس کے بعد جو علوم میں مہارت پیدا کرنا چاہیں انھیں مرکزی مدارس میں بھیجا جائے اور پھر اس ماحول اور علم کی روشنی میں بتدریج ان کی اصلاح کی جائے شرکیہ رسوم مٹائی جائیں۔ اسلامی معاشرت اور اس میں بھی خصوصیت سے مساوات، ہمدردی، ایثار، تواضع اور خدمتِ خلق کا جذبہ خاص طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، پھر ساتھ ہی ان میں باہمی امر بالمعروف کا جذبہ اور سلیقہ پیدا کرنے پر بھی پورا زور صرف کیا جائے۔

(۹) تبلیغی جماعتیں کچھ کچھ وقفہ سے تبلیغ شدہ مواقع پر مکرر سہ کرر پہونچ کر سابقہ تبلیغ کے اثرات کا جائزہ لیں اور آئندہ تبلیغ کا پروگرام ڈالتی رہیں۔

(۱۰) تبلیغی سلسلہ میں جو بھی کام ہو اصحابِ تبلیغ اس کی یادداشتیں

تاریخ وار مرتب کر کے مرکز میں بھیجتے رہیں تاکہ ضرورت پیش آنے پر ان سے کام لیا جا سکے۔ خصوصاً غنا، وایثار پر بہر صورت زور دیا جائے۔

تلك عشرة كاملة

مسلم کی شوکت و قوت کا راز

یہ دس دفعات ہیں جن پر عمل درآمد کرنے سے نہ صرف اسلامی برادری میں اضافہ ہی ہوگا بلکہ خود مسلمانوں کی اصلاح بھی ہوگی جو مقصدِ دیانت ہے اور ان میں یک جہتی کے ساتھ نظم بھی پیدا ہوگا جو مقصدِ سیاست ہے اور اس طرح مسلمانوں کی دیانت و سیاست دونوں کا ایک اچھا پرداز پڑ جائے گا جس کا رنگ خالص دینی اور اسلامی ہوگا اور اس سے ان غلط رنگوں کے اتر جانے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے جو آج کی دشمنِ دیانت اقوام نے مسلمانوں میں پیدا کر دیئے ہیں؛

افسوس ہے کہ آج ہم اپنی غلط فہمی اور غلط روی سے اپنی شوکت و قوت یا غلبہ و تسلط کو اعداد و شمار کے نوشتوں اور اقلیت و اکثریت کی الجھنوں میں تلاش کر رہے ہیں۔ جلسوں کی آرائش اور تجویزوں کی نمائش میں ڈھونڈھ رہے ہیں، مظاہروں کی گرم بازاری اور نعروں کی شوراشوری میں سمجھ رہے ہیں اور جیسا سمجھا دیا گیا ہے سمجھتے چلے جا رہے ہیں لیکن حقیقت اس

کے خلاف ہے۔

مسلمانوں کی شوکت دعوت کا راز شعائرِ دین کے اونچا کرنے اور کلمۂ حق مسلسل پہونچاتے رہنے میں مضمر ہے جس سے اتحادِ عمل، طبقاتی اعتماد و توازن، امیر و غریب کا اختلاط، معاملاتی مساوات اور اپنے مفاسد و نزاعات پر خود قابو پالینے کے جذبات خود بخود پیدا ہو سکتے ہیں جس کے لئے یہ دفعاتِ بالا پیش کی گئی ہیں۔

اگر مبلغینِ اسلام آیت دعوت کے پیش فرمودہ قوانین کے ماتحت ہر ہر قصبہ اور گاؤں میں یہ تبلیغی نظم قائم کردیں جس میں دین و دنیا دونوں منظم ہو جاتی ہیں اور چند مواضع میں بھی اس کا نمونہ قائم ہو جائے تو گمان ہوتا ہے کہ جلد جلد حالات تبدیل ہونے لگیں گے اور اہم خوشگوار نتائج کی توقع قائم ہو سکے گی۔
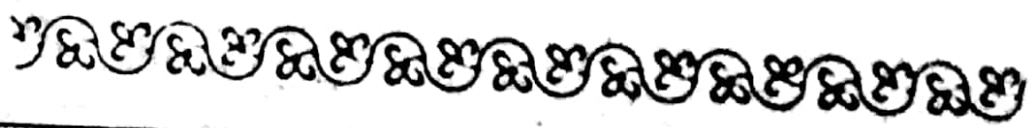
ہماری چند مطبوعات
مظاہر حق قدیم کامل
بہشتی زیور مدلل جدید
اشہاب الثاقب
انیس الواعظین
اسوۂ رسول اکرم
فروع الایمان
فتاویٰ رشیدیہ
احکام میت
احکام الاسلام عقل کی نظر میں
حسن پرستوں کا انجام
خطبات الاحکام
حکایتوں کا گلدستہ کلاں
فہرست کتب مفت طلب فرمائیں
Kutub Khana Rahimia
Deoband-247554
Thanvi Graphics